الایام: مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ وثقافت، کراچی جلد:۳، شمارہ:۱، جنوری۔ جون ۲۰۱۲ء

پروفیسر عابد صدیق: ایک ہیرا تراش کردار

حافظ صفوان محمد چوہان

Abstract

Upbringing of children is a delicate job. Doing it in such a fatherly manner that, maintaining their Islamic & cultural integrity, they become able to frictionlessly & fittingly live in today's religio-political currents and are able parts of national & international society, is a pressing need. This article is a highly commending picturesque of Prof Abid Siddique's art which he used for developing the attitude of *peaceful coexistence* in his son in one of the most politically and religiously polarized eras of our national life.

یہ تحریر محض ذاتی حوالے اور نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اِس لیے اِس میں خاندان کے افراد کا ذکر کم سے کم ہے۔ اُن لوگوں کا بڑا جگرا ہوتا ہے جو اپنے والد پر مضمون لکھ لیتے ہیں۔ یہ جرات والد کی زندگی میں تو شاید کی جاسکتی ہو کہ بچے کی کارگزاری دیکھ کر والد حوصلہ بڑھاتا اور دعا دیتا ہے۔ والد کی وفات کے بعد لکھنا تو ایک ایسا کام ہے جسے بیان کرنے کے لیے کوئی مناسب لفظ

میرے پاس نہیں ہے۔ میرے والد جناب عابد صدیق بالقابہ کے دوست ڈاکٹر نواز کاوش اور اُن سے پہلے ڈاکٹر سید شاہد حسن رضوی نے حکم دیا کہ اُن پر تفصیلی مضمون لکھوں۔ ابوجان کی وفات کو اب کچھ عرصہ ہوگیا ہے تو شاید ایسا لکھ سکوں کہ میری سعادت مندی ہی کی داد نہ دی جائے۔ کوشش کروں گا کہ سنی سنائی روایات کی بجائے صرف اُن باتوں کو ذکر کروں جو میں نے خود دیکھی، سنی یا محسوس کی ہیں ورنہ یادیں اور مشہورات اِتنے زیادہ ہیں اور اِس طرح چھوٹ چھوٹ کر بھاگ رہے ہیں جیسے چمچے کے دونوں طرف سے سویاں پھسل پھسل کر گرتی ہیں۔ جو باتیں یہاں ابوجان کے حوالے سے لکھوں گا اُن میں سے کچھ کو لفظاً لفظاً بیان کرنا ممکن نہیں کیونکہ لفظ خواہ کتنے ہی پراثر ہوں بہرحال لکیریں اور علامتیں ہوتے ہیں جو کسی واقعے یا تناظر کی شناخت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اِن علامتوں کی نشست میں ذرا ذرا تبدیلی سے واقعات الگ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں کچھ الفاظ باندک تصرف ذرا آگے پیچھے ضرور ہوں گے لیکن مطالب پر اِن شاء اللہ کوئی زد نہیں آتی۔ مزید اطمینان کے لیے اشاعت سے پہلے اِس تحریر کو ابوجان کے مزاج آشنا اور ہم جوار چند بزرگوں کو دکھا بھی لیا ہے۔ ہمارے خاندان کے اِس وقت سب سے بڑے بزرگ چچا جان زاہد صدیق اور اُن کی لائق بیٹی ڈاکٹر عاصمہ فیصل نے بھی اِس تحریر کو بہت سراہا ہے۔ نیز میں نے اُن باتوں کو دوہرانے سے گریز کیا ہے جو مختلف مضامین اور خطوط وغیرہ میں موجود ہیں تاکہ اِن سب تحریروں کی ضرورت باقی رہے۔

ابوجان کے حوالے سے وہ پہلی بات جو مجھے یاد ہے، ملتان میں ٹبی شیر خان والے گھر میں کرسی سے گرنا ہے۔ الماری کے اوپر رکھی خمیرے کی ڈبیہ اٹھاتے ہوئے میں پھسل کر گر پڑا تھا۔ میرے رونے پر ابوجان اندر آئے اور مجھ موٹے تازے گلگوتھنے کو اللہ کا کا کرتے ہوئے کندھے پر بٹھا لیا۔ اُن کے سر پر ہلکے ہلکے بال تھے جن میں سے سر نظر آرہا تھا۔ خمیروں کی ڈبیاں چٹ کرنا اور اِنھیں ہم بچوں سے بچانے کے لیے جتنا بھی اوپر کر کے رکھا جاتا، چند دنوں میں وہاں تک میرا ہاتھ پہنچ جانا ایک معمولی بات تھی۔ بلکہ بعض اوقات تو ہمارے چاچا جی شاہد اِن شرارتوں میں تَعاوَنُوا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوان کرتے۔ ضرورت پڑنے پر یہ ڈبیاں اکثر خالی ہی ملتیں۔ پھر یہ خالی ڈبیاں کھڑکی سے باہر پھینکی جانے

لگیں۔ میں دعا گو ہوں حکیم محمد حنیف اللہ صاحب کے لیے جو نہایت لذیذ خمیرے بناتے تھے اور جنھوں نے ہمارے گھر میں اِنھیں کبھی ختم نہ ہونے دیا۔ ابوجان کا چینی کی پلیٹوں پر زعفران کی روشنائی سے آیتیں وغیرہ لکھنا اور دھوکر ہمیں پلانا، مصلے پر بیٹھے رہنا، ہمیں نہلانا دھلانا، گرہستی کے کاموں میں لگے رہنا، کپڑے دھونے والے کرکٹ بیٹ نما تھاپے سے کپڑے کوٹنا، صحن میں ٹرائی سائیکلوں پر چکر لگاتے ہوئے ہمارا نورانی قاعدہ سنانا..... یہ میرے ملتان کے بچپن کا کینوس ہے۔ اِنھی دنوں کی ایک سناٹے دار یاد اِکہتر کی جنگ کے دنوں میں ابوجان کا ایک رات بلیک آؤٹ کے وقت گھر سے باہر رہ جانا ہے جسے میں جنرل نیازی پر اپنے مضمون میں لکھ چکا ہوں۔ ایک یہ بات بھی کچھ کچھ یاد ہے کہ ابوجان اللہ کے راستے میں گئے ہوئے تھے تو میں گھر میں رکھے ہارمونیم، طبلے کی جوڑی اور سارنگی وغیرہ اٹھا کر باہر سڑک پر رکھ آیا تھا، جنھیں کوئی باذوق اٹھا کر لے گیا تھا۔

ہم بہاول پور آئے (۱۹۷۳ء) تو ہمیں مدرَسے میں داخل کرایا گیا۔ ابوجان ہمیں سائیکل پر مدرَسے لاتے لے جاتے۔ مجھے آج بھی جھرجھری آجاتی ہے یہ سوچ کر کہ صبح کالج جانے سے پہلے ہمیں مدرَسے چھوڑنا، دوپہر میں گھر لاکر آرام کرانا، ظہر کے وقت پھر سے چھوڑنا اور عصر کے وقت واپس لانا..... میں اپنے بچوں کے لیے اِتنی ڈیوٹی کبھی نہیں کرسکا۔ ہمیں دوپہر میں مدرَسے میں کبھی نہیں چھوڑا گیا۔ اِس مشقت کا نقد فائدہ ابوجان کو یہ ملا کہ ہوش میں آنے سے پہلے میں حفظ مکمل کرچکا تھا۔

☆.....ا.....☆

اب کچھ ایسی ممتاز باتوں کا بے ربط سا احوال جو میں نے اُن میں بحیثیتِ باپ پائی ہیں۔

میں ابھی میٹرک میں تھا کہ ایک شام ٹیبل ٹینس کی میز آگئی۔ اِس کے بعد سالہا تک یہ معمول رہا کہ ہم سب سنگلز اور ڈبلز کے ٹیبل لگاتے۔ بیسٹ آف فائیو اور بیسٹ آف سیون تو عام بات تھی، ہم بیسٹ آف الیون تک کھیلتے تھے۔ گرمی ہو یا سردی، مغرب کے بعد ہم لوگ کھیلتے کھیلتے پسینوں پسین ہوجاتے۔ ابوجان کی سروس اور لانگ شاٹ بہت اچھی تھیں اور وہ ہمیں خوب پداتے۔ مجھے یہ ترتیب باپ بننے اور بچوں کے بڑے ہونے کے بعد سمجھ میں آئی کہ کس طرح ابوجان نے ہمیں شام کے وقت باہر پھرنے سے روکا تھا۔ اِس ایک آئٹم کے گھر میں لانے سے شام کا باہر پھرنا بند، سب گھر والوں کے اکٹھا ہونے اور نظروں کے سامنے رہنے، جسمانی ورزش، اور ایک بڑے عالمی کھیل کا سیکھ جانا، یہ سبھی

کچھ یک کرشمہ کئی کار ہوگیا۔

اِسی طرح مجھے ڈاڑھی رکھوانے کا واقعہ ہے۔ میں نے میٹرک کے وظیفے سے الیکٹرک شیور لیا کہ ڈاڑھی آنے پر اِس سے مونڈا کروں گا۔ ایف ایس سی میں تھا کہ سبزہ آغاز ہوا۔ رمضان آیا تو میں قاری تھا اور میرا ایک کلاس فیلو سامع کیونکہ اُس کے ڈاڑھی نہ تھی۔ ابوجان نے فرمایا کہ ڈاڑھی رکھنے کے بارے میں سوچ لو کیونکہ بغیر ڈاڑھی کے لوگ تراویح نہیں سنتے۔ الغرض کئی دن تک ''مشورہ'' ہوتا رہا، اور بالآخر ڈاڑھی رکھنے کے بارے میں جی میں آ گئی۔ میں ڈاڑھی رکھوانے کی اُن کی تکنیک پر آج تک عش عش کرتا ہوں۔ فرماتے تھے کہ ڈاڑھی صرف قدیم تہذیبوں کا رواج نہیں بلکہ اللہ نے مردوں کو ڈاڑھی سے زینت دی ہے اور عورتوں کو مینڈھیوں سے، چنانچہ مردوں اور عورتوں کو اپنی زینت اور للّٰہی وجہِ امتیاز نہیں کھونی چاہیے۔ اور ڈاڑھی سنت ہے، لہٰذا نیکی ہے۔

ایسا ہی ایک واقعہ اور۔ میں زکریا یونیورسٹی کے زمانے میں سر پر پگڑی اور کاندھے پر چار خانے کا رومال رکھتا تھا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب میں پگڑی باندھ کر پہلی بار ابوجان کے سامنے گیا تھا تو اُنھوں نے بے اختیار اُٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے کس گرم مہری سے میرا ماتھا چوما تھا۔ یونیورسٹی سے فراغت پر ایک روز ابوجان نے فرمایا کہ کیوں نہ تمھیں واسکٹیں سلوا دی جائیں۔ میں نے کہا کہ نیکی اور پوچھ پوچھ، سو بسم اللہ۔ فوراً درزی کے پاس لے گئے اور ایک نہ دو پوری چھ واسکٹیں بنوا دیں۔ میری محکمۂ تعلیم میں نئی نئی ملازمت ہوئی تو ایک شام میرے کاندھے سے رومال اتار کر ایک طرف رکھا، میرا عمامہ اتارا اور اُس میں سے ٹوپی نکال کر میرے سر پر رکھی اور فرمایا:

If you are a molvi then you'd look like a molvi. But if you are an officer, you'd be looking like an officer.

پھر فرمایا کہ مسواک کرنا سنت ہے لیکن مسواک اور کنگھی وغیرہ کو سامنے کی جیب میں لگائے پھرنا خلافِ سنت ہے۔ سنت کا مذاق نہیں اُڑوانا چاہیے۔ اِسی طرح ایک انٹرویو کے لیے مجھے جناح کیپ پہنائی۔ میں نے فوراً اعتراض داغا کہ یہ خلافِ سنت ہے۔ فرمایا کہ ٹوپی کی کوئی مخصوص صورت سنت نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ آدمی کسی چیز کو جہاں کھڑا ہوکر دیکھ رہا ہے اُسے دیکھنے کا صرف وہی نقطۂ نظر (Point of View) صحیح ہو، اُس نقطۂ نظر سے ذرا سا ہٹ کر دیکھنے سے چیزیں ایک اور پہلو سے نظر

آتی ہیں اور بسا اوقات منظر زیادہ واضح ہوجاتا ہے۔ ہمارے اکثر ملازمت پیشہ بزرگ جو بڑے عہدوں تک گئے ہیں، دفتری اوقات میں جناح کیپ ہی استعمال کرتے رہے ہیں۔ اِسے ایک طرح سے دفتری یونیفارم سمجھو۔ ورنہ تو شیروانی اور دوپلی ٹوپی بھی سنت نہیں ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ سنت کے نام پر کوئی انوکھا لباس ڈاٹ کر لوگوں میں انگشت نما ہوجانا درست نہیں۔ مختصراً یہ کہ وہ روحانیت کو رہبانیت کا مرادف نہیں جانتے تھے۔

ابوجان نے مجھے مختلف مذہبی و سیاسی نظاموں میں اترنے کا باقاعدہ موقع دیا۔ آج بحیثیتِ باپ اِس تکنیک کو دیکھتا ہوں تو سمجھ آتی ہے کہ یہ اس لیے کیا تھا کہ مجھے کوئی حسرت رہ جائے اور نہ کوئی غلط فہمی یا لاعلمی۔ میں آج بحمداللہ بہت بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں کہ مختلف جماعتوں اور اتحادوں کے محرّک کیا کیا اور اِن کے محرّک کون کون ہیں۔ میں نے کئی جماعتوں کے بیج لگائے اور اُن کے لیے کام کیا، اور اُن کے جھنڈے اور پوسٹر اپنے کمرے میں لگائے۔ سیاسی علماء کی للک پر لبیک کہتے ہوئے اُنھیں اُن کے مالہٗ وماعلیہ سمیت کندھوں پر اٹھا اٹھا کے جلوس نکالے، اور اہلِ جلسہ کی تشریفات و کمریات کی ڈنڈا افزائی اور چھترولِ عام شروع ہونے سے پہلے اُنھیں چھابوں میں بند کرکے باہروں باہر فرار کرانے والوں کا عینی شاہد رہا۔ مسلکی اور گروہی نعرے لگائے اور لگوائے۔ فرقہ ورانہ اشتہار لگائے اور لوگوں کے گھروں کی دیواریں کالی کیں۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں نوٹوں پر مہریں لگانے والی حرکت بھی کی (جس پر ابوجان نے میری ٹھیک ٹھاک مرمت کی کیونکہ مرمت کے بغیر ٹھیک ہونا عادۃً ممکن نہیں ہوتا)۔ ہمارا لڑکپن سادہ لوحی کا زمانہ تھا اور اپنے دوستوں کی طرح میں بھی دینی غیرت کے نام پر مسلکی جذبات بھڑکانے والے ہر نعرے مار کے پیچھے چل پڑتا تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ کس طرح میں ایک شعلہ بار مقرر کے مطالبے پر ۳۱۳ کفن پوش بریگیڈ میں شامل ہوگیا تھا۔ لوگوں کے پیسے کے بل پر خدمتِ اسلام کرنے والے اللہ کے اِس شیر کا چندے کی آمدنی پر یقین اِتنا پختہ تھا کہ وہ اِن شاء اللہ تک کہے بغیر یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اُسے اگر ۳۱۳ سرفروش مل جائیں تو وہ دنیا سے فلاں فرقہ ہمیشہ کے لیے نابود کردے گا۔ طلبہ ایسے باز ہوتے ہیں جنھیں سیاسی اور مذہبی شکاری اپنا بازیچہ بنا لیا کرتے ہیں!

اِسی طرح ایک بار میں کچھ لوگوں کے بہکائے میں آکر شیعیت کے خلاف خاصا بھڑک گیا اور شہر بھر کی سڑکوں کے نام صحابہؓ اور دیوبندی اکابر کے ناموں پر رکھنے کے لیے کچھ نوجوانوں کو ساتھ

لے کر بروئے کار ہوگیا۔ قریب تھا کہ شہر میں فرقہ واریت کا سونامی آجاتا اور دمادم مست قلندر ہوتا کہ ابوجان کی نچنتی میں چنتا پیدا ہوئی۔ مجھے تنہائی میں لیا اور ایک لمبی کلاس لی۔ اُنھوں نے آقائے موید الاسلام کا ایک جملہ سنایا جو مجھے اب بھی یاد ہے، کہ شیعیت ایک سیاسی مسلک ہے اور جن صحابہؓ اور تابعین کے درمیان یہ جھگڑا کھڑا ہوا تھا وہ سب کے سب انتقال فرما گئے ہیں اور وہ خلافت بھی کہ جس کی وجہ سے یہ جھگڑا ہوا تھا کب کی ختم ہوگئی ہے، لہٰذا اب اِن بحثوں کا کوئی جواز نہیں ہے۔ فرمایا کہ یہ اختلافات ہمارے بڑوں کے تھے اور ہمارے لیے سب بڑے بڑے ہیں لہٰذا سب سے محبت رکھو۔ اُن کا معاملہ اللہ کے پاس ہے۔ اللہ نے ہمیں اُن سے محبت رکھنے کو کہا ہے نہ کہ اُن کا معاملہ فیصل کرنے کا۔ ہوش کرو اور اُن کے معاملے میں نہ پڑو۔ ہر مورخ کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے اِس لیے تاریخ کو صرف تاریخ سمجھ کر پڑھتے ہیں اور کسی پر حکم نہیں لگاتے۔ صرف تاریخ اور ماضیات ہی ہماری پونجی نہیں۔ اپنی آخرت کی فکر کرو اور اُن سوالات کی تیاری کرو جو قبر و حشر میں پوچھے جانے ہیں۔ پہلا سوال نماز کا ہوگا۔ بتاؤ تم دوستوں نے آج کتنی نمازیں پڑھی ہیں؟ بات کھل گئی۔ ایک حدیثِ پاک کا مفہوم ہے کہ قیامت کے دن مفلس ترین شخص وہ ہوگا جو دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت برباد کرلے۔ اللہ ہمیں معاف کرے کہ کچھ لوگوں کا سیاسی قد بلند کرنے کے لیے ہم اپنے نماز جیسے فرض کی ادا کاری چھوڑ رہے تھے، یعنی اُن کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت برباد کر رہے تھے۔

ایک دور میں میں فرقہائے باطل کے خلاف پڑھتے پڑھتے برادرم ڈاکٹر ذاکر نائیک کی طرح کا ایک چھوٹا موٹا انڈیکسر بن گیا تھا اور لاہ پھاہ کے فن میں ایسا اتارو ہوگیا تھا کہ کسی بھی فرقے کے خلاف گھنٹوں تقریر جھاڑ سکتا تھا۔ میرے دوست ادریس اختر لون نے ایک بار مجھ سے پوچھا کہ غلام احمد پرویز کیوں غلط ہے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دلائل سے پرویزیت کا دھواں اُڑا دیا۔ کہنے لگا کہ میرا سوال یہ نہیں، میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ اسلام کی وہ تعلیمات کیا ہیں جن پر پرویز کے عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے اُسے غلط کہا جاتا ہے؟ اِس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر پوچھے پاچھنے اور بہت ٹَل لگانے کے بعد بالآخر ابوجان سے رجوع کیا۔ فرمانے لگے کہ لوگوں کی کمیاں دیکھنے سے یہی کیفیت ہوجاتی ہے۔ فرقہ وارانہ لٹریچر پڑھنے سے تعمیرِ ذات نہیں ہوتی۔ تعمیریت پر مبنی چیزیں پڑھنے سے ذہن تعمیری سوچ پر آتا ہے۔ تفریقیت پر مبنی لٹریچر سے دین کی خدمت نہیں ہوتی بلکہ یہ تنفر پیدا کرتا ہے، اور

یہ بھی ہوتا ہے کہ شدہ شدہ اِس کا زہر اپنی رگوں میں اترنے لگتا ہے۔ رکنے کی چیزوں سے روکنے کی بجائے کرنے کی چیزوں کے کرنے کا کہنا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ بار بار روکنے سے تو الٹے ڈھٹائی پیدا ہوتی ہے۔ فرقہ ورانہ مناظرے کرنے والے اکثر مشہور لوگوں کی موت برے حال پر آئی ہے۔ اِس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی ترتیب پر چلنا بہترین پالیسی ہے، کہ جس برائی کو مٹانا مقصود ہو اُس کا ذکر ترک کردو۔ مجھے اعتراف ہے کہ ابوجان کی اُس دن کی گفتگو نے مجھے مذہب کی تنگنائے سے اسلام کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ اِس کے بعد سے میں یہی سمجھتا ہوں کہ دین کے اصول وہی ہیں جو ایمانِ مفصّل اور ایمانِ مجمل میں بیان ہوئے ہیں اور ہر وہ مسئلہ فروعی ہے جو اِن میں مذکور نہیں۔ مثلاً نماز تکبیرِ تحریمہ سے لے کر سلام تک ہے، اِس سے آگے اور پیچھے جو کچھ ہے وہ ہر مکتبِ مذہبی فکر کا اپنا اپنا ہے اور جس پر سب کو برداشت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ نماز کا وقت ہو تو جس کی نماز جس کے پیچھے ہوتی ہے اُسے اُس کے پیچھے پڑھنی چاہیے۔ نماز نہ پڑھنا کفر والی حرکت ہے چنانچہ نماز بہرحال پڑھنی چاہیے، چاہے نماز کا ظاہری ڈھانچہ کوئی ہی ہو۔ نماز کی کسی مخصوص صورت کو حتمی بتانا اور بقیہ صورتوں پر چیں بجبیں ہونا درست نہیں۔ نماز کی ہر صورت اللہ کے نبیؐ کی پیاری سنت ہے، اور اللہ نے ہر سنت کو زندہ رکھنے کا بندوبست فرما رکھا ہے۔ اگر ہمیں ادارِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ ہے تو اُن کی ہر ادا سے محبت کو دل میں جانشیں کرنا چاہیے نہ کہ کسی ایک ادا سے محبت اور باقی اداؤں سے نفرت۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے حوالے سے فرماتے تھے کہ سو شہیدوں کا ثواب مٹی سنت کو زندہ کرنے سے ملتا ہے، سنت کے مقابلے میں سنت کو کھڑا کرنے سے فساد پھیلتا ہے۔

ایف ایس سی کے دنوں میں سرحد پر بھارتی فوج چڑھ آئی تو مجھے جہاد پر جانے کا چاؤ چڑھا۔ پڑھائی وڑھائی چھوڑ کر جہادی ٹریننگ کیمپوں کی ڈھنڈس شروع کردی۔ قریب تھا کہ للہ فی اللہ کسی کے ہتھے چڑھ جاتا کہ ایک روز ابوجان نے مجھے پکڑا اور سمجھایا کہ دیکھو ہم نے گھر بنواتے وقت طرح طرح کے مستری مزدور لگوائے ہیں۔ کوئی اینٹ سیمنٹ کا کام کر رہا ہے کوئی لکڑی کا، کوئی پانی کی پائپیں لگا رہا ہے اور کوئی گیس کی پائپیں۔ ہر ایک کہہ رہا ہے کہ عابد صدیق گھر بنا رہا ہے، حالانکہ میں نہیں بنا رہا بلکہ یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ اگر تم اور میں یہ تعمیراتی کام کرنے لگیں تو کوئی بھی کام سیدھا نہیں ہوگا۔ اِسی طرح یہ سمجھو کہ حکومت نے مختلف صلاحیتوں کے لوگوں کو چھانٹ چھانٹ کر اُن پر قومی و ملکی

وسائل لگائے ہیں۔ کسی کو ڈاکٹر بنایا ہے اور کسی کو انجینئر، کسی کو فوجی اور کسی کو سویلین، کسی کو عالم و مفتی بنایا ہے اور کسی کو پروفیسر، وغیرہ۔ ہر ایک کو اپنے مقررہ دائرۂ عمل کے اندر کام کرنا چاہیے۔ اِسے تقسیمِ کار کہتے ہیں۔ اگر اپنے دائرے سے نکلو گے تو اغراض ٹکرائیں گی اور لوگ مخالف بنیں گے۔ اگر سب لوگ بھارت سے جہاد کرنے کے لیے یا کشمیر و افغانستان وغیرہ نکل جائیں تو باقی کام کون کرے گا۔ یہ بات آہستہ آہستہ سمجھ میں آئی، خصوصاً یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ بات انفرادی دائرۂ عمل ہی کے لیے درست نہیں بلکہ اجتماعی دائرۂ عمل کے لیے بھی ایسی ہی ہے، مثلاً ریاستی اداروں میں تصادم اُس وقت ہوتا ہے جب یہ ایک دوسرے کے کام میں مداخلت کرنے لگتے ہیں۔ ہر سرکاری ملازم ٹیکس اور دفاعی فنڈ میں پیسہ دینے کی وجہ سے سرکاری فوج کے ساتھ جہاد میں باقاعدہ اور عملاً شریک ہے۔ جیسے فوج کو سویلین معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے ویسے ہی عوام کو بھی وطن کے دفاعی معاملات میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔ اگر اسکول کالج کے بچے بچیاں جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں تو فوج کی وجہِ وجود ہی زائل ہوجاتی ہے۔ اللہ ہماری فوج کو سلامت رکھے کہ وہ قوی اور ملّی مفاد کے لیے بہترین انداز میں کام کر رہی ہے۔ سب پاکستانی اگر بدل اپنے اپنے محاذوں پر کام کرتے رہیں تو یہی فوج کی پشت پناہی ہے۔

ہمارے سکول، کالج اور پھر یونیورسٹی کے زمانے میں افغان جہاد کا بہت غلغلہ تھا۔ چنانچہ جہاد میں عملی حصہ لینے کے بارے میں ابوجان مختلف انداز میں سمجھاتے رہتے تھے۔ کئی بار فرماتے کہ کفار مسلمانوں پر اِس لیے چڑھے آتے ہیں کہ اُنھیں اپنا دشمن خیال کرتے ہیں۔ اُن کی غلط فہمی دور کرو۔ اُن سے محبت رکھو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پر تلوار اٹھائی ہے تو اُس کی وجہ غضب نہیں تھا بلکہ شفقت تھی۔ بھائی عبدالوہاب صاحب کے حوالے سے بتاتے تھے کہ مسلمان اگر دل میں ابوجہل والا جذبہ لے کر لڑتا ہے تو اِسے جہاد نہیں کہا جا سکتا اور اِس پر اللہ کی کسی مدد کا وعدہ نہیں ہے۔ کبھی بتاتے کہ صلحِ حدیبیہ سے پہلے اور بعد کی نبوی محنت اور حکمتِ عملی پر غور کرو۔ صلحِ حدیبیہ تک کے انیس سال میں دو طرفہ ٹھنی رہی اور اِس عرصے میں ڈیڑھ ہزار لوگ مسلمان ہوئے جب کہ معاہدۂ امن کے بعد آئندہ چار سال میں یہ تعداد سوا لاکھ تک پہنچ گئی۔ اور اللہ نے صلحِ حدیبیہ کو کھلی فتح قرار دیا ہے اگرچہ ظاہراً یہ نیچے لگ کر کی گئی صلح تھی۔ وغیرہ۔ ابوجان کی زندگی کے لازمی معاملات میں ہوش مندی سے ظن و تخمین کرنے کی ایسی باتوں کی مفیدیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر کھلی، اور یہ سلسلۂ فیض جاری ہے۔

کالج کے ابتدائی زمانے میں میں کچھ لاادریانہ اور اہلِ ظواہر ٹائپ صحبت میں جا پہنچا۔ آیتوں کے لفظی معنی میں الجھنا، مغیباتِ خمسہ، پانچ کے بجائے تین نمازوں اور عذابِ قبر کے قرآنِ پاک میں مذکور نہ ہونے پر گفتگو کا لپکا۔ وغیرہ۔ ایک بار کچھ ایسی اتھاہ آزاد خیالیاں ابوجان کے حضور پیش کیں تو اُنھوں نے قرآنِ پاک کے بالواسطہ اور استعاراتی اُسلوب کی کئی مثالیں دیں اور فرمایا کہ قرآنِ پاک کی آیات پرازمعنی اِس لیے ہیں کہ اِسے قیامت تک چلنا ہے۔ ہر دور میں نئے نئے سوالات پیدا ہوتے ہیں، اور اگر ہر دور کے مسئلے کا ایک آیت میں جواب نہیں ملتا تو یہ قرآنِ پاک کا عجز نہیں بلکہ اعجاز ہے۔ یہ باتیں کرتے ہوئے اُنھوں نے ایک جملہ ارشاد فرمایا جو ایک طرح سے ضرب المثل بن گیا: قرآنِ پاک میں اگر اچار بنانے کی ترکیب نہیں ہے تو یہ قرآن کی کمی نہیں ہے۔ قرآنِ پاک انسانیت کی ہدایت کے لیے اترا ہے، اور یہ مقصد قرآن پورا کرتا آیا ہے اور قیامت تک کرے گا۔

میرے بی ایس سی کے زمانے میں بہاول پور میں ابوجان کی ایماء پر پروفیسر ظفر احمد چودھری صاحب نے ہم نوجوانوں کی تربیت کے لیے ہفتہ واری لیکچر شروع کیے جن میں وہ صحابۂ کرامؓ کے مقام کو قرآنِ کریم سے سمجھاتے تھے۔ یہ ذہنی غذا ہمارے لیے ضروری تھی۔ میں نے ابوجان سے کئی بار اختلافاتِ صحابہؓ پر بات کی۔ ایک بار سمجھاتے ہوئے کہا کہ دیکھو مطلق صداقت یا بے لاگ لگاؤ سچائی (Absolute Truth) ممکن ہی نہیں سوائے اِس کے کہ اللہ ایک اور قائم بالذات ہے۔ باقی سب صداقتیں اضافی ہیں یعنی ایک دوسری کے سہارے قائم ہیں۔ پھر فرمایا کہ دیکھو ابھی جنرل محمد ضیاء الحق کا ریفرنڈم ہوا ہے جس کی رپورٹنگ حکومتی اخبارات میں کچھ ہے اور حکومت مخالف اخبارات میں کچھ، جب کہ یہ ہماری آنکھوں دیکھی بات ہے۔ اِس بارے میں صرف ہم بتا سکتے ہیں کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔ آج سے پچاس سال بعد والے لوگ اِن دونوں انتہاؤں کے شارح ہوں گے۔ صحابہؓ کے اختلافات کی رپورٹنگ کو بھی ایسے ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ یہ بھی مختلف لوگوں نے کی ہے اور صرف چند لوگوں نے کی ہے جنھیں خوبیِ قسمت سے رپورٹنگ کا موقع مل گیا، اور جسے بعد والوں نے اپنے اپنے سیاسی و مذہبی رنگ میں لے کر چلا دیا ہے۔ ہمارے لیے سمجھ داری کی بات یہ ہے کہ ہم کسی ایک رپورٹ کو پڑھ کر صحابہؓ پر کوئی حکم نہ لگائیں۔ اور اصل میں دیکھنا یہ چاہیے کہ ہم سے صحابہؓ کے کسی عمل کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔ ہم اُن کا مسئلہ حل نہیں کر سکتے۔ بس سب صحابہؓ صحیح ہیں کیونکہ

براہِ راست آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اور فیضِ صحبت پائے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ سبھی لوگ ستاروں کی مانند ہیں۔ اگر (نعوذ باللہ) صحابہ ہی ٹھیک نہیں ہیں تو بعد والے کیسے ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ میں رپورٹ کیا گیا صرف وہی واقعہ درست ماننا چاہیے جس سے صحابہؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلقین کے مقام پر زد نہ آتی ہو، ورنہ کوئی اچھی تاویل کرنی چاہیے۔

ایسی ہی ایک اور مثال۔ پروفیسر حسین احمد علوی صاحب (چشتیاں) اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ اُنھیں علمائے دیوبند سے بے انتہا محبت تھی اور میں نے اُن جیسا فنا فی الدیوبندیت بزرگ نہیں دیکھا۔ ایک بار علمائے ہند کا شاندار ماضی بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک ایک کاہکشاں کی سیر کرائی اور بتایا کہ حضرت شاہ صاحب نے نظامِ معیشت کا ایسا نظریہ پیش کیا تھا کہ آج کے بڑے ماہرینِ معاشیات اگر اِسے پڑھ لیں تو دنیا کی معیشت سدھر جائے۔ میں اِس پر ایمان لے آیا اور جگہ جگہ اِس پر تقریریں کرنے لگا۔ آج سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ میٹرک کا ایک طالبِ علم جو شاہ ولی اللہؒ کی دو کتابوں کا نام تک نہ جانتا تھا، کیسے اُن کا پرجوش ''شارح'' بنا پھرتا تھا۔ بہرحال چند دن کے بعد ابو جان نے مجھے پکڑا اور فرمایا کہ برخوردار اوّل تو تم نے شاہ ولی اللہؒ کی کوئی کتاب پڑھی نہیں اور نہ ابھی تمھاری اِس مطالعے کی عمر ہی ہے، اور دوسرے یہ کہ اِس نظریے میں اگر چلنے کی قوت ہوتی تو یہ ضرور چلتا کیونکہ دنیا بھر میں معیشت کی سمجھ رکھنے والے ماہرین پڑھے لکھے لوگ ہیں اور یہ نظریہ اُن سے مخفی نہیں ہوسکتا۔ ضروری نہیں کہ ہر اچھا نظریہ قابلِ عمل بھی ہو۔ بہرحال میں سوکھا تب ہوا جب میں نے اپنے مبلغِ فکر کی پیالی کے اِس طوفان کو ایک خط کی شکل دے کر اُس وقت کے وزیرِ خزانہ ڈاکٹر محبوب الحق کو بھیجا۔ اُن کے دفتر سے شکریے اور میری گزارشات پر توجہ کرنے کا رسمی جوابی خط آیا، اور مجھے آرام۔

اُنہی دنوں صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے مجلسِ شوریٰ بنائی اور اُن کے اسلامی اِقدامات کی عوامی تائید کے لیے ہمہ پرسی (ریفرنڈم) ہوئی، اور پھر صلوٰۃ کمیٹیاں بنیں جو لوگوں کو نماز کی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ مجھے حکومت کے مختلف اِقدامات میں اپنے اِس ''تاریخی خط'' کی جھلک نظر آتی (تاریخی اِس لیے بھی کہ اِس پر کوئی تاریخ ضرور ڈالی تھی)۔ یہ خمارِ خط جنرل صاحب کی شہادت کے بعد تک رہا۔ اپنی اِس سادگی اور حماقت کو آج مڑ کر دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اگر احمقوں کے سروں پر سینگ

ہوتے تو میں بارہ سنگھا ہوتا!

ابو جان فرماتے تھے کہ حلال اور حرام چیزیں اللہ کی حکم فرمودہ ہیں۔ یہ کام عام لوگوں کے کرنے کا نہیں۔ مثلاً یہ کہ فلاں لباس حرام ہے، یا مثلاً ننگے سر نماز حرام ہے۔ اگر یہ کرو گے تو سب کافر ہو جائیں گے اور تم اکیلے مسلمان رہ جاؤ گے۔ اپنی پسند کی بسم اللہ کے گنبد میں رہنا درست مذہبی و سماجی رویہ نہیں۔ ایک مثال لیجیے کہ میں نے اِس موضوع پر کئی بار تفہیماً بات کی کہ جب قرآنِ پاک کی حرام کردہ چیزوں میں موسیقی شامل نہیں ہے تو موسیقی کو کس نے حرام کیا ہے۔ ایک بار اِس کے جواب میں فرمایا کہ اِس بات کو اُس تناظر میں سمجھو جس میں کچھ علماء قرآنِ پاک کا ترجمہ یا تفسیر پڑھنے کو منع کرتے ہیں۔ ترجمۂ قرآن یا تفسیر خدانخواستہ ''حرام'' نہیں ہے بلکہ یہ مناہی طبائع کے اعتبار سے ہے کہ عام لوگ اِس کی سہار نہیں رکھتے اِس لیے تھوڑا سا پڑھ لینے سے اُبھر جاتے ہیں اور اپنے اپنے مطلب نکالنے لگتے ہیں اور ہر نتھو خیرا بیچ کلیان جسے پاکی پلیدی تک کے مسائل نہیں آتے، مفسرِ قرآن بن جاتا ہے۔ محتاط علماء نے اصلاً ایسے لوگوں کے لیے قرآنِ پاک کا ترجمہ و تفسیر خود پڑھنا منع بتایا ہے جن کی اِس سلسلے کی بنیادی تعلیم نہ ہو۔ جو لوگ فہمِ قرآن کے لیے لازمی بنیادی علوم میں رواں ہیں اُن کے لیے ترجمہ پڑھنا کوئی منع نہیں کرتا۔ بحمداللہ بات سمجھ میں آ گئی اور ذہن میں کل بل کرتے سوالات تھوڑے دنوں میں سب گرد ہو گئے۔ میں اِس ضمن میں ابو جان کے روحانی تصرف مبذول کرنے کو بھی واضح محسوس کرتا ہوں۔ یہ بات بھی ذکر کر دوں کہ ابو جان کی ریاضی (Mathematics) بہت اچھی تھی اور وہ تان پلٹوں کا ریاضی کے فارمولوں کی بنیاد پر پھیلاؤ اور سکڑاؤ سمجھنے سمجھانے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ (میں Wave Theory کے حوالے سے موسیقی میں اُن کی درّا کی کی اِس جہت کا تذکرہ ایک اور جگہ کر چکا ہوں۔) وہ موسیقی کی سائنس میں رسوخ فی العلم رکھتے تھے اور درست لفظی معنوں میں موسیقی کے عالمِ باعمل تھے، گو رفتہ رفتہ یہ تعلق صرف علمی رہ گیا تھا۔ افسوس کہ نئی تانتی کو معلوم ہی نہیں کہ موسیقی نرا علمِ ریاضی ہے، چنانچہ ہماری اپنی مایا اور میراث ہے۔

میں پیروں کے بارے میں ضرورت سے زیادہ غیر معتدل بلکہ استہزائیہ رویہ رکھتا تھا اور اِس بارے میں ابو جان کے سامنے لگی لپٹی رکھے بغیر بولا کرتا تھا۔ ایک بار وظائف اور تسبیحات کی تعداد وغیرہ کے موضوع پر کوئی چھوڑی تو فرمایا کہ دیکھو! حدیثِ پاک میں کلونجی اور شہد میں شفا بتائی گئی ہے۔ اب یہ

نسخہ کوئی ماہر حکیم ہی بتا سکتا ہے کہ کلونجی کے کتنے دانے اور شہد کی کیا مقدار کس بیماری میں مفید ہے، اور یہ نسخہ ہر مریض کی کیفیت اور موسم وغیرہ کے مطابق الگ ہوگا۔ بالکل اِسی طرح ذکر اذکار میں کوئی اہلِ نسبت کسی سالک کو اُس کی روحانی کیفیت کے مطابق کبھی کوئی اور کبھی کوئی ذکر اور اِس کی مقدار تجویز کرے گا۔ یہ بات کچھ ایسے انداز میں کہی کہ بحمداللہ میرا دل ہمیشہ کے لیے اِس دوری سے دور ہوگیا۔ ذکر منزل نہیں بلکہ راستہ ہے، اور منزل اللہ کا دھیان نصیب ہونا ہے۔

ایک سیاسی نیم مذہبی پریشر گروپ کے مطاع ایک بار تشریف لائے اور تبلیغی جماعت کے سامراجی ایجنٹ ہونے پر دلیلیں اور اپنی ڈھائی ٹوٹروؤں کی جماعت کو ووٹ دینا قرآن و حدیث سے ثابت کرتے رہے۔ یہ دونوں چیزیں ابوجان کے مزاج کے سخت خلاف تھیں لیکن وہ مجسم کان بنے رہے۔ میں نے ''کلمۂ حق'' کہنے کی کوشش اور اُن کی جماعت کے سورج کے رخ کے ساتھ بدلتے مذہبی و سیاسی مواقف کا آئینہ دکھانے کا ارادہ کیا تو مجھے طریقے سے روک دیا۔ میں چپکا ہولیا۔ جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔ بعد میں مجھے فرمایا کہ مہمان کی دلدہی اللہ اور رسولؐ کا حکم ہے، اور یہ مہمان کا ادب ہے کہ اُس کی بات سن لی جائے۔ جو مہمان کی بات میں ٹوکا ٹاکی کرتا یا اُس سے بحث کرتا ہے اُسے میزبانی کے آداب ہی معلوم نہیں۔ میں شدید تپا ہوا تھا۔ میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے مولانا محمد الیاسؒ کا ایک ملفوظ سنایا کہ دوسرے کی کمی کو اپنی کمی سمجھنا چاہیے، اور کمی تو ہمارے اندر تھی کہ اُن کا اِکرام نہ کرسکے کہ اُن کی دعوت قبول کرنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا، حالانکہ وہ ہم سے امید لے کر آئے تھے۔ زمانہ گواہ ہے کہ میرے ابوجان رکھ پت رکھا پت کے آدمی تھے اور خوانخواہ کی لابہ گری اُن کا مزاج نہ تھا، لیکن علمائے کرام کے سامنے بچھے جانا بھی گویا اُن پر ختم تھا۔ علماء کے بارے میں وہ مسلک زدگی کا شکار بھی نہ ہوتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اصل عالم وہ ہے جس کے جسم کے ہر عضو سے حالاً اور قالاً اللہ کا امر سنت طریقے پر ظاہر ہو رہا ہو، لیکن جس نے بھی علمِ دین پڑھنے میں ایک عمر لگائی ہے اُس کا احترام گویا علمِ دین کا احترام ہے۔ عالم کا بوجہِ علم احترام ضروری ہے، پے اطاعت ہونا ضروری نہیں۔ فرماتے تھے کہ علماء کی غیبت نہیں کرنی چاہیے۔ اُنھیں توبہ کے طریقے آتے ہیں۔

ایک بار مقامی گشت کے بعد بیان میں میں نے نماز کے آداب کو اللہ کا حکم بتایا اور اِس میں کچھ غلو کیا۔ بعد میں ابوجان نے مجھے حکم اور ادب کا فرق کچھ اِس طرح سمجھایا کہ مثلاً بھوک لگنے پر کھانا

کھانا اللہ کا حکم ہے۔ اِس کے آداب سنت کے مطالعے اور دینداروں کی صحبت سے معلوم ہوں گے۔ کسی کو چھینک آئے تو چھینکنے والے کے لیے اور چھینک کی آواز سننے والے/ والی کے لیے الگ الگ احکامات ہیں۔ یہ احکامات کتابوں سے معلوم ہوں گے اور اِس کے آداب دینداروں کی صحبت سے سیکھے جائیں گے۔ علم کتابوں سے آتا ہے اور آداب صحبت سے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو صحابہ کہنے کی وجہ یہی صحبت ہے جو سوائے اُن خوش نصیب لوگوں کے کسی کو نہیں ملی۔ صحبت کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے اور نہ کوئی متبادل۔

ایک بار ایک بڑے مولانا تشریف لائے ہوئے تھے کہ میرے نام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا خط آیا۔ میری مسرت دیدنی تھی۔ باتوں کا رخ غیر منقسم ہندوستان کی طرف ہوگیا اور ایسی باتیں چل پڑیں جن کا عینی شاہد ہم میں سے کوئی نہ تھا۔ اُن مولانا نے ایک بزرگ کا واقعہ سنایا جس میں وہ ایک چوپائے سے مخاطب ہوئے تھے اور وہ اُن کی بات سمجھ گیا تھا۔ وہ تو خیریت گزری کہ یہ ''گفتگو'' دوطرفہ نہیں بتائی۔ میں اِس بات کو پی گیا۔ حاضرین کی بردباری اُن کی مشقِ سخن کو تازیانہ ہوئی اور معلوم ہوا کہ یہ نمونہ تھا، مال پیچھے آرہا ہے۔ اُن بزرگوں کا واقعہ پیچھے واقعہ، اور ہر واقعے میں مختلف چوپایہ۔ بارے چوپائے ختم ہوئے اور دوپایوں کی باری آئی تو ایک واقعہ یہ سنایا کہ ہمارے حضرت قنوتِ نازلہ پڑھتے تو محراب لرز جاتی تھی۔ اب کے میں نے منہ کھول ہی دیا کہ یہ قنوت انگریزوں کے خلاف ہوتی تھی یا ہندوؤں کے؟ اُنھوں نے اُس وقت کی مقبول ترین مسلم سیاسی جماعت کا نام لیا۔ میں نے اُس جماعت کی حمایت میں ایک آدھ جملہ کہہ دیا— بس یہ حمایت قیامت ہوگئی اور اُنھوں نے اُس جماعت کے بارے میں وہ گھڑمس مچایا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ اُن کا کوئی لفظ یاد ہو یا نہ ہو، کھانا کھاتے ہوئے وہ مجسم تقریر تھے اور ہر لقمہ محض اِک ماندگی کا وقفہ تھا یعنی آگے چلنے کے لیے دم لینے کا بہانہ۔ اُن کی بدن بولی، لام کاف، گھرکیاں دیتے چہرے کے پھاڑ کھا جانے والے نقش اور کفِ دہاں کے رہ رہ کر اُڑتے چھینٹے مجھے کبھی نہیں بھول سکتے۔ مہمانوں کا کھانا چھوٹ چھاٹ گیا۔ دسترخوان بڑھایا گیا۔ مولانا کا سمندِ گفتار روندا راندی پر برابر تہور رہا۔ اُن کے بس میں ہوتا تو ایمانِ مفصل اور ایمانِ مجمل میں اپنے حضرت پر ایمان لانے کی شق داخل فرما دیتے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں سوچتا ہوں کہ کیا مختلف سیاسی قبلہ رکھنے والا مسلمان ایسا کالا کافر ہو جاتا ہے کہ سورۂ ممتحنہ میں ذکر کردہ اللہ کے قرار دیے ہوئے کافروں

سے پینگیں بڑھانا اور کلمہ گوؤں کے لیے قنوتِ نازلہ پڑھنا جائز ہو جائے؟ اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بات مذہبی اختلاف میں بڑھے یا سیاسی میں، تالی دو ہاتھوں سے بجتی ہے! اپنے چاہیتے حضرت کی حضرتیت کو بڑھاتے بڑھاتے اُسے اَنَا رَبُّکُمُ الاعلیٰ کا مجسمہ بتانا اور اُس پر ''ایمان'' لوانے کے لیے ایسی کرامات کو ذکر کرنا جن میں جانوروں نے آنحضرت کی ولایت کی تصدیق کی ہو، شدید بدمذاقی ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے۔ کچھ تو خیال کرنا چاہیے۔

ایسی ہی ایک اور بات۔ ایک سوانح میں میں نے ایک مجہول الاحوال راوی کی زبانی کہلوایا گیا یہ واقعہ پڑھا کہ اُس نے شاید آنکھوں سے یا پھر خواب میں دیکھا کہ حاجیوں سے بھرا ایک جہاز جب متلاطم سمندر کے تھپیڑوں سے ڈولنے لگا تو اُسے دو بزرگوں نے کندھوں پر اٹھا لیا اور آگے دھکیلتے رہے اور فرماتے رہے کہ ''گھبراؤ نہیں گھبراؤ نہیں''۔ چنانچہ سارا قافلہ بحفاظت بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ بزرگوں کی بزرگی اور بزرگداشت سر آنکھوں پر اور کرامتیں برحق، دم درود، پھونک پھانک اور شو پڑھنا بھی برحق، لیکن کرامتوں کا تعارف سلامتیِ طبع سے کرانا چاہیے۔ یہ واقعہ ابوجان کو سنایا اور اُن سے اُن واقعات پر باتیں کیں جن میں بندے اللہ سے زیادہ قادرِ مطلق نظر آتے ہیں (نعوذ باللہ)۔ فرمایا کہ ہر وارداتِ قلب تحریر کیے جانے کے لائق نہیں ہوتی۔ سوانح نگار اپنے ممدوحین کو بشریت کے خیمے کے اندر نہ رکھیں تو مضائقہ ہے۔ تمھارے بیان کردہ واقعے میں مذکور دونوں بزرگ انسان تھے اور اُس وقت ڈولتے جہاز میں خود سوار اور لامحالہ شدید پریشان تھے۔ جب لوگ ہائے وائے کر رہے ہوں گے تو وہ یقیناً اللہ کی طرف متوجہ اور ظاہرہ طور پر مطمئن ہوں گے۔ بس اِسی واقعے کے چنے پر عقیدت کا بہت سارا گُڑ چڑھا لیا گیا ہے۔ معتقدِ میرِ قسم کے اور معتعن راویوں کی زیب ہائے داستاں کو چھوڑ کر امرِ واقعہ پر نگاہ رکھا کرو، اِن شاء اللہ بزرگوں کے بارے میں دل کھٹا نہیں ہوگا۔

مسلمانوں کی کوتاہیوں کو مین مین کر نکالنا ایک بھیانک مرض ہے جس کے تعفن کو ''تلاشِ حق'' کی عطر بیز چادر چڑھا کر گوارا بنایا جاتا ہے اور اِن کمیوں کا اشتہار لگاتے پھرنا دعوتِ حق کا مترادف سمجھ لیا جاتا ہے۔ نگاہِ خطا بین رفتہ رفتہ اسلام کے خانہ ساز ورژن پر ایمان پختہ کرا دیتی اور ''جو نہ مانے وہ بھی کافر'' قرار دلوا دیتی ہے۔ ایک تبلیغی سفر میں ایک مفکرِ اسلام کے ہاں حاضری ہوئی جنھیں میں مزاحاً اسلام کا پیتھالوجسٹ کہتا ہوں۔ (مفکرِ اسلام بایں معنیٰ کہ اُنھیں اسلام کی فکر پڑی رہتی ہے۔) فرما رہے تھے

کہ اقبال ذہنی انتشار کا شکار تھے اور اسلام کے بجائے مارکسی اور اِشتراکی نظاموں کو پسند کرتے تھے اور اُن کے پچاسوں شعر اور سارے خطبات کباڑیات کے ڈھیر ہیں؛ شبلی اور ابوالکلام آزاد شرمناک حرکتیں کرتے رہے ہیں جن میں شطرنج بازی، کبوتر بازی اور دیگر کئی قسم کی بازیاں شامل ہیں؛ حضرت مدنی سے فلاں فلاں غلطیاں ہوئیں؛ امین احسن اصلاحی انگریزی سے مرعوب تھے؛ مودودی کی فکر غلط تھی؛ تقی عثمانی غلطِ محض ہیں اور ایسا اسلام پیش کر رہے ہیں جس سے سرمایہ دار مسلمانوں کا رانجھا راضی ہوتا ہے؛ جاوید غامدی جاہلِ محض اور دورِ حاضر کا دجال ہے؛ ذاکر نائیک ہنود و یہود کا آلۂ کار ہے؛ مولانا طارق جمیل جاگیردار اور ایجنسیوں کے آدمی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اُن کا بیٹا چائے وائے لایا تو بتانے لگے کہ یہ جہادسٹ ہوگیا ہے، اور پھر جہادی پارٹیوں کی صفت سرائی فرمائی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ صدرِ اسلام کے بعد سے لے کر آج تک چودہ سو سال میں پوری دنیائے اسلام نے صرف ڈھگّے پیدا کیے ہیں سوائے دو مسلمانوں کے: ایک وہ بذاتِ خود، اور دوسرا میں، جو اُن کا سامع تھا۔ اور میری یہاں سے واپسی کے بعد زمین کی پشت پر صحیح مسلمان صرف ایک رہ جائے گا! قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اپنی طویل گلفشانیِ گفتار میں اُنھوں نے مرزائے قادیان یا غلام احمد پرویز وغیرہ کی قبیل کے کسی گم کردہ راہ شخص کے ذکر سے اپنی زبانِ حق بیان کو آلودہ نہیں کیا۔ مجھے ابوجان کی ایک نصیحت یاد آئی جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ امت کے سوادِ اعظم کے ساتھ چلنا چاہیے نہ کہ یوسفانِ بے کارواں یا مسترد کیے ہوئے لوگوں یا ٹوٹے ہوئے ستاروں کے پیچھے اور میں سمجھتا ہوں کہ ٹوٹ کر گم ہوتے شہابیے میں یہ خوبی تو پھر بھی ہے کہ وہ کبھی ستارہ تھا، جب کہ یہاں کیا تھا؟ محض اعتراض، اعتراض اور اعتراض! رنگین شیشوں کی عینک سے رنگین ہی نظر آتا ہے۔ کیا ممتاز مسلمانوں کی کمیوں کا انڈیکس بنانا اور اُن پر سے اعتماد اٹھانا خدمتِ اسلام ہے؟ صرف خرابیاں دیکھنا تو، برادرم محمد سہیل عمر کے الفاظ میں، قارورے دیکھنے کا کام ہے یعنی وہ کام جو پیتھالوجسٹ کرتے ہیں۔ جو کم قسمت شخص یہ کام کرتا ہے اُسے توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوتی۔ اللہ معاف کرے۔

ابوجان فرماتے تھے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ نہیں چلنا چاہیے جن کی ہر ایک سے لڑائی ہو اور جن کا ہر نسخہ ''ہوالاختلاف'' سے شروع ہوتا ہو۔ فرماتے تھے کہ کیا مذہبی اور کیا سیاسی، اکثر جماعتوں کے پاس کوئی مستقل پروگرام ہے ہی نہیں۔ جیسی ہوا چلتی ہے، خشک پتوں کی طرح یہ بھی الٹتے پلٹتے کبھی اِدھر گرتے پڑتے ہیں کبھی اُدھر۔ ہر روز کوئی نیا باطل کھڑا ہو جاتا ہے۔ زندگی ختم ہو جاتی ہے باطل ختم نہیں

ہوتے۔ باطل سے پنجہ آزمائی اور اصلاحی کام دونوں مبارک ہیں اور دونوں باہمد گر ضروری ہیں۔ تمھیں چاہیے کہ سب کے لیے دل میں محبت رکھتے ہوئے مولانا محمد الیاسؒ والی ترتیب پر اصلاحی و تربیتی جہد میں لگو، اور اِس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی مصری کی مکھی بنے نہ کہ شہد کی مکھی۔ اختلافِ امت کو ابوجان دل کی گہرائی سے اللہ کی رحمت سمجھتے اور اِس کی مثال منہ میں موجود دانتوں سے دیتے، جو ہر لحہ ایک دوسرے کے خلاف کام کرتے ہیں لیکن اِس اختلاف سے غذا چبائی جاتی ہے اور یہ سب مل کر زبان کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔

میرے ابوجان ایک باخدا اور ذاکر شاغل آدمی تھے۔ جب تبلیغی نقل وحرکت کے زیادہ قابل نہ رہے تو عصر کے بعد بڑی دیر تک مصلے پر رہتے۔ اُن کے دل کی دنیا آباد تھی۔ عملیات کی کچھ نایاب قوتیں بھی اُنھیں ۔اِصل تھیں۔ لیکن اُن کے اِس بوریے میں بوئے ریا نہ تھی۔ اُن کے متحیر کر دینے والے ایک ایسے واقعے کا میں عینی شاہد ہوں کہ اگر کوئی بھی مجھ سے ایسا دعویٰ کرتا تو میں سائنس کا طالبِ علم ہونے کی وجہ سے کبھی اعتبار نہ کرتا۔ بتاتے تھے کہ یہ چیزیں صرف ارتکازِ توجہ سے حاصل ہوتی ہیں اور اِن کا اسلامیات یا روحانیات سے کوئی تعلق نہیں، اور اِسی لیے یہ ہندو جوگیوں کے ہاں زیادہ ملتی ہیں۔ ایک وقت آیا کہ میں نے بھی دو ایک قریبی دوستوں بشمول برادرم مولانا محمد احمد معاویہ، عملیات میں کوشش شروع کی۔ اللہ نے دنوں دنوں میں بے حد ترقیات نصیب کیں۔ مجھے اِس سے منع بھی نہیں کیا لیکن جب میں نے کچھ خاص چیزیں عطا کرنے کو کہا تو فرمایا کہ اِن چیزوں کا ایک خاص عمر سے پہلے مل جانا نقصان دہ ہوتا ہے۔ ایک نصیحت کی کہ کسی عامل کے چکر میں نہ پڑنا اور بتایا کہ اِن لوگوں کے گینگ اور مافیا ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے تعلقات اور رقابتیں رکھتے ہیں۔ کوئی آدمی کسی کے پاس پھنس جائے تو ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا عامل چلتا چلا جاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ جو مسلمان باوضو رہتا ہو، پیٹ میں حلال کے علاوہ کچھ نہ ڈالتا ہو، معاملے کا صاف ہو، نماز کا پابند ہو، اور آیۃ الکرسی اور معوذتین جانتا ہو، وہ خود عامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگوں کو باوجودیکہ اِس سب کے ساتھ ہوتے ہیں، اپنی خفتہ صلاحیتوں کا علم نہیں ہوتا۔

ہمارا سکول کالج کا زمانہ وہ تھا جب پاکستان میں شدید مذہبی قطبیت پیدا کرنے کی نئی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں۔ کافر سازی کا کاروبار عروج پر تھا اور اپنے مذہبی پردھان کے علاوہ کسی کے

لیے محض نرم گوشہ رکھنا منافق قرار دیے جانے اور کسی مسجد میں نماز کے لیے جانا بند کرانے کے لیے کافی جرم تھا۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ عام لوگ سڑک پر ایک دوسرے کو سلام کرتے ہوئے گزرتے ہیں لیکن مختلف مسجدوں میں نماز پڑھنے کے لیے جاتے نمازیوں کی گردنوں میں ایسا سریہ لگا ہوتا تھا کہ سر کی خفیف سی حرکت تک نہ ہونے دیتا تھا، دعا سلام تو بہت دور کی بات ہے۔ آٹھ اور بیس تراویحوں، فاتحہ خلف الامام، رفعِ یدین، مسئلۂ نور و بشر، حیات وممات، ڈاڑھی کی لمبائی اور خط، ننگے سر نماز، انگوٹھے چومنا اور نماز میں ہاتھ ناف سے اوپر یا نیچے باندھنا، اصحابِ کہف کی تعداد اور اُن کی مدتِ نوم، انبیاء کا علمِ غیب، مولانا مودودی کو (اللہ معاف کرے) سو یہودیوں کے برابر ثابت کرنا، پاسپورٹ کے نیشنلٹی والے خانے میں ''پاکستانی'' لکھنے والے کے اسلام کا معرضِ خطر میں آجانا، بانیِ پاکستان بابائے قوم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کو قائدِ اعظم کہنے والے کا تخفیف یا توہینِ رسالت کا مرتکب ہونا، وغیرہ، وہ ''زندہ'' مسائل تھے جن پر اشتہار بازی اور مناظرے/مناظرانہ تقریریں ہوا کرتے تھے۔ امریکہ کچھ مسلمان ممالک کو ساتھ لے کر کسی مسلمان ملک پر حملہ کرتا تو یاجوج ماجوج والا قصہ اُس پر فِٹ کرنے کے لیے راتوں رات بڑی بڑی کتابیں چھپ جاتیں جن میں بیسیوں آیتوں اور سیکڑوں حدیثوں کی تفسیر بالرائے کی گئی ہوتی۔ وقت گزر جانے پر اپنی بات کے جھوٹا ثابت ہونے اور آیات واحادیث کو دریدہ دہنی سے اپنے مطلب کے معنی پہنانے والے ایسے کسی مصنف یا اِن کتابوں کی تقریظیں لکھنے والے کسی عالم کو میں نے معذرت کرتے نہیں پایا۔ ہر حج پر حضرت امام مہدی کے ظہور کا انتظار ہوتا جن کے بارے میں کبھی پتہ لگتا کہ فلاں مدرسے میں پڑھ رہے ہیں یا فلاں ملک میں ہیں؛ تحقیق سے پتہ چلا کہ عبداللہ نام کے جس بے چارے ذات کے سید کا بیٹا نوجوان اور متدین ہوتا اُسی کے سر پر مہدیت کا ہما بٹھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ مادام بے نظیر بھٹو کی وزیرِ اعظمی کے دور میں بیشتر علماء اور مذہبی جریدوں نے عورت کی حکمرانی کے موضوع پر ''عورت حکمران ہو تو زمین کا پیٹ زمین کی پیٹھ سے بہتر ہے'' (مفہومِ حدیث) کی روشنی میں عوام کی جہالت دور کرنے کا عزم بالجزم کیا ہوا تھا، جس کا چکنا نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی علماء کی کھلی اور درپردہ سپورٹ کی وجہ سے وہ دو بار وزیرِ اعظم بنیں۔ اُس وقت پاکستان غیرت بریگیڈ بھی انگوٹھا چوس رہی تھی۔ اِس افسوسناک صورتِ حال پر تکبیر نے ٹائٹل پر ایک کارٹون شائع کیا تھا جس میں مادام بھٹو پارٹی جھنڈے کے تین رنگوں کی مناسبت سے سرخ دوپٹہ، کالی قمیص اور سبز شلوار پہنے

امامت کرا رہی تھیں اور نامی گرامی سیاسی علماء اُن کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ''مادام'' کی منزل سے گیا کون سلامت! ابوجان نے نہایت بیدار مغزی سے مجھے (آج کی صحافتی اصطلاح میں) پرامن بقائے باہمی (Peaceful Coexistence) کے اصول پر مختلف الخیال مکاتبِ فکر میں ''اپنی چھوڑو نہیں دوسروں کو چھیڑو نہیں'' کی پالیسی پر چلتے ہوئے رہنا سکھایا تاکہ میں ایک دوسرے کا احترام کرنا سیکھوں اور امتیوں میں بکھری ہوئی مسلمانانہ خوبیاں جذب کرسکوں۔ مذہبی رواداری اور مذہبی بے غیرتی میں کا فرق اُنھوں نے اپنے عمل سے سمجھایا۔ فرماتے تھے کہ اگر کافر کافر میں فرق نہ ہوتا تو سورۂ فاتحہ میں دومختلف طرح کے کافروں کا ذکر نہ ہوتا۔ وہ ارسطو کا یہ قول بار بار سنایا کرتے تھے کہ انسان ایک سماجی جانور ہے (Man is a social animal.)، جسے انسانوں میں رہنا نہیں آتا وہ جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ میں نے یونیورسٹی کی ایک جوشیلی طلبہ جماعت کو اسلام کا ٹھیکے دار کہا اور اُن کے خلاف کچھ سوالوں کے جواب چاہے تو فرمایا کہ بیٹے اللہ کا نام لینے والے ہر ایک کی قدر کیا کرو، کچھ عرصے بعد اللہ کا محض نام لینے والے لوگ بھی عام نہیں ملیں گے۔ کبھی کبھی بڑے دکھ کے ساتھ کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کو مسلمان کیا کرتے تھے جب کہ آج ہمارے اکثر لوگ مسلمانوں کو غیر مسلم بنانے کا کام کرتے ہیں۔ یہ اِس تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج میں بحمداللہ دل کی گہرائی سے ہر کلمہ گو کو مسلمان سمجھتا اور اُس کی قدر کرتا ہوں۔ سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ آپ کا ہم الٰہ اور ہم رسول آپ کا بھائی ہے خواہ ناراض بھائی سہی، اور خواہ آپ اُسے اپنا بھائی تسلیم ہی نہ کریں۔ پرلے درجے کا بدکردار اور بدبودار مسلمان اور عقیدے کے اعتبار سے شدید ترین مغالطے میں مبتلا مسلمان بھی مسلمان ہوتا ہے، اور مسلمان ہونا کافر ہونے سے بہرحال بہتر ہے کیونکہ مسلمان کو یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا سے خطاب کیا گیا ہے۔ نفرت کفر سے ہونی چاہیے کافر سے نہیں۔ کافر تو امتِ دعوت ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو دعوت یعنی اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ کا مصداق ہی کوئی نہ رہے گا۔ اگر کافر سے نفرت رکھنا روا ہوتا تو حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم مطعم بن عدی کے بارے میں یہ نہ فرماتے کہ آج اگر وہ حیات ہوتے اور مجھے کہتے تو میں بدر کے سب قیدیوں کو بغیر فدیے کے رہا کر دیتا۔ (مطعم کا آپ علیہ السلام پر یہ احسان تھا کہ طائف سے واپسی پر اُنھیں اپنی امان میں مکہ لائے تھے جب مکہ میں سے کسی نے بھی آپؐ کو امان نہ دی تھی، اور آپؐ زخمی حالت میں مکہ سے باہر کمپرس پڑ رہے تھے۔)

لیکن اِس بات کو بالصراحت اور تحدیث بالنعمۃ کے طور پر ذکر کروں گا کہ ابوجان کی یہ تربیت صرف فکری نہیں تھی بلکہ اِس نے عملاً بھی اپنے ظہور کے راستے بنائے تھے۔ باقی سب چھوڑیے، میرے ابوجان نے مجھے بحمداللہ اِس قابل بنا دیا تھا کہ اُن کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے مولانا محمد احمد انصاری صاحب نے مجھے حکم دیا تھا!

تربیتِ اولاد کارگہِ شیشہ گری ہے: آنکھ ذرا چوکی نہیں اور بچے کی شخصیت تڑقی نہیں۔ اِس تذکرے میں میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ابوجان نے مجھے پاکستان کی بہترین یونیورسٹی میں اپنے دور کی بہترین سائنسی تعلیم دلائی۔ مجھے بے تکلف اور مالوف کرنے کی باقاعدہ کوشش کی۔ معاملات میں گفتگو کرنا سکھایا۔ اور اِس تربیت میں کہنے سے زیادہ کر کے دکھایا۔ فرماتے تھے کہ جس تعلق میں دین کا فائدہ ہو نہ دنیا کا، وہ نری خواری ہے (یہ بات ابھی کچھ عرصہ پہلے سمجھ میں آئی)۔ حکم کی بجائے مشورۃً بات رکھتے۔ بلاواسطہ کسی کام کے کرنے کا بہت کم کہتے۔ آخری عمر میں تو شاید ہی کبھی کہا ہو۔ اکثر کسی رابطے واسطے سے کہلواتے۔ البتہ دعا ضرور کرتے۔ جہاں میری شادی ہوئی وہاں کے لیے میں تیار نہ تھا۔ ابوجان نے پنجاب یونیورسٹی لاہور تشریف لا کر میرے دوستوں اشتیاق مرزا وغیرہ کے ذریعے مجھے راضی کرایا۔ میری شادی نہایت مناسب عمر میں اور نوکری لگنے سے پہلے کی۔ (میرا نکاح پڑھانے کے لیے رائے ونڈ سے مولانا سعید احمد خاں صاحب تشریف لا رہے تھے کہ ٹریفک جام میں پھنس گئے۔ وقت تنگ تھا۔ گھڑی آدھ گھڑی میں عصر ہونے والی تھی۔ چنانچہ نکاح ابوجان نے خود پڑھایا۔)

ایک بار فرمایا کہ جب اللہ تمھیں بیٹا دے گا تو پھر تمھیں معلوم ہوگا کہ بیٹے کے حق میں باپ کی دعا کیوں قبول ہوتی ہے۔ یہ دعا اِس لیے قبول ہوتی ہے کہ باپ بیٹے سے مقابلہ نہیں کرتا بلکہ دل کی انتہائی گہرائی سے چاہتا ہے کہ جو مجھے نہ مل سکا وہ میرے بیٹے کو مل جائے۔ جب میرا بیٹا (اب ماشاء اللہ حافظ) عکرمہ محمد چوہان ذرا سا بڑا ہوا تو مجھے یہ بات سمجھ میں آئی۔

☆.....۲.....☆

بحیثیتِ استاد میں نے ابوجان کو ہمیشہ لیکچر تیار کر کے آتے دیکھا۔ کتاب میں روزانہ ہر کلاس کے لیے شذرات پر مشتمل چٹیں رکھتے۔ شاعری ہو یا نثر، پڑھاتے وقت وہ اردو اور مشرقی ادب کی تہذیب (Culture) اور نظریۂ کائنات (Worldview) کا مغربی ادب کے متعلقہ زاویوں سے

موازنہ کرتے جاتے، اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اپنی مایا کو اُنھوں نے کبھی ہلکایا ہو۔ مجھے ارسطو، افلاطون، لانجائنس، ورڈزورتھ، کولرج، شیکسپیئر، آرنلڈ، ڈاکٹر جانسن، برنارڈ شا، ٹالسٹائی، ماروپل، گوئٹے، فلپ سڈنی. بائرن، ملٹن، ٹینی سن، ایزرا پاؤنڈ، کیٹس، والٹ وھٹمین، رابرٹ فراسٹ، رچرڈز، پوپ، ہیگل، ایلیٹ، کارلائل، آسکر وائلڈ، فلابیئر، ورجینیا وولف، رسکن، برٹرینڈ رسل، ہیمنگوے، وغیرہ کے بارے میں موٹی موٹی باتیں ایف ایس سی ہی میں پتہ لگ گئی تھیں حالانکہ میں سائنس کا طالبعلم تھا۔ ہم سائنس کے لڑکوں کو پڑھانے کے لیے ابوجان شاید خاص طور سے تیاری کر کے آتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اِن بچوں کو اردو ادب اور اُس کی بے مثال خوبیوں سے گوش آشنا کرانے کا یہ پہلا اور آخری موقع ہے اور آئندہ زندگی میں اِن کا واسطہ صرف انگریزی سے رہے گا۔ پڑھاتے ہوئے شاعروں کے حالات، شاعری کا منظر نامہ اور خصوصاً انگریزی شعراء کی استعمال کردہ تراکیب بتاتے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے ڈائیلاگ سناتے۔ لیکن یاد رہے کہ انگریزی ادب سے یہ ''بے تکلفی'' اور ''چھیڑ چھاڑ'' صرف اور محض ضمنی ہوتی تھی۔ سچی بات ہے کہ سائنسی تعلیم میں ادب کا نگندہ ڈالنے کی ضرورت کا احساس اُن کی زندگی میں مجھے کبھی نہیں ہوا، جس کے لیے اپنی سی پدرانہ کوشش اُنھوں نے ضرور کی تھی۔

اُن کا لیکچر زندگی سے بھرپور ہوتا تھا اور بوریت بالکل نہ ہوتی تھی۔ مثلاً ایک بار تشبیہ کی مثال دیتے ہوئے بتایا کہ تشبیہ موقع اور ماحول و ماحضر سے قائم ہوتی ہے اور ایک ہی وقت میں ایک واقعے کی تشبیہ باہم بالکل مختلف ہوسکتی ہے۔ مثلاً باغ میں ایک بینچ پر دو شخص بیٹھے ہیں۔ پہلے کی اُس کے محبوب سے ملاقات ہوئی ہے اور دوسرے کی نہیں۔ ہوا چلی اور پتے ہلے۔ پہلا شخص کہتا ہے کہ پتے تالیاں بجا رہے ہیں، دوسرا کہتا ہے کہ پتے کفِ افسوس مل رہے ہیں۔ ایسے ہی ایک بار کہیں ''زہر خند'' کی ترکیب آ گئی۔ اِس کا مطلب بتانے لگے تو دیکھا کہ ایک لڑکے کے امتحانی گتے پر مونا لیزا کی بڑی سی تصویر بنی ہے۔ اُس کے پاس گئے، گتہ لیا اور اُسے سب لڑکوں کے سامنے کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اِس عورت کے منہ پر جو مسکراہٹ ہے اُسے زہر خند کہتے ہیں۔ یہ شاید اپنے شوہر پر ہنس رہی ہے اور اِس کے شوہر کو یہ طنزیہ ہنسی زہر لگتی ہوگی۔ (براہو سائنس کی ترقیات کا۔ تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ مونا لیزا کسی تصوراتی عورت کی تصویر نہیں بلکہ اصلاً یہ لیونارڈو ڈاونچی کا اپنا پورٹریٹ ہے جس میں ترمیم کر کے اُس نے اِسے عورت بنایا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ ہر کامیاب عورت کے پیچھے ایک مرد ہوتا ہے!)

وقت پر کلاس لینا اور وقت پر چھوڑنا، اُن کی عادت تھی۔ پڑھاتے ہوئے وہ موضوع سے بالکل نہ ہٹتے چنانچہ اپنا سلیبس وقت سے پہلے ہی مکمل کرا دیتے۔ ہر سوال کا شافی جواب دیتے لیکن اِس کی آڑ میں وقت نہ گالتے۔ وہ اپنے طلبہ کی علمی استعداد سے واقف تھے اِس لیے سوال کرنے والے لڑکوں کی حوصلہ افزائی کرتے نہ کہ اُنھیں گدھا ثابت کرتے۔ کوئی مشکل لفظ آتا تو اُسے ایسے سمجھاتے کہ اُس کی گھاڑت یعنی مادّے (Root) کا بھی پتہ لگ جاتا۔ مثلاً ''خیازہ'' کے بارے میں بتایا کہ یہ ''خام'' سے مشتق ہے جس کا معنٰی نقص اور اَدھورا پن وغیرہ ہے؛ خام سے خامی بنا، اور خامی سے خامیازہ، جو چلتے چلتے خمیازہ بن گیا۔ چنانچہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اِس لفظ میں خ پر پیش نہیں ہو سکتی (جیسا کہ عام سننے میں آتا ہے)۔ ''کارستانی'' کی اصل ''کارِ شیطانی'' بتائی۔ ''رخسانہ'' کے بارے میں بتایا کہ اِس کا ''رخسار'' سے کوئی تعلق نہیں اور یہ عربی نہیں بلکہ لاطینی الاصل ہے، اور اِس کے لیے رکسونا صابن کی مثال دی۔ بتایا کہ ''چالان'' اور ''چٹ'' انگریزی نہیں بلکہ اردو کے اپنے لفظ ہیں۔ وغیرہ۔ کئی بار بتایا کہ لفظ میں سے اُس کا جوہر یا مادّہ (جسے آسانی کے لیے Main Building Block کہہ لیجیے) کیسے نکالا جاتا ہے اور تعلیقیے (Affixes) کیسے الگ کیے جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ صرف اردو کے لیے نہ تھا بلکہ انگریزی کے الفاظ بھی برابر زیرِ بحث آتے۔ ایک بار "Unbecoming-like Officer" کی تفصیل بتائی جو میرے کئی ہم جماعتوں کو آج تک یاد ہے۔ ہم چھوٹے سے شہر کے کھوتی سکولوں میں پڑھے اردو میڈیم والے بچے انگریزوں کی انگریزی یوں احترام سے سنتے جیسے وحی اتر رہی ہو تو ایسے مواقع پر وہ انگریزوں کی تمسخر اتارنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ایک بار کسی سبق میں ترکیب ''کثیر الاولاد'' آ گئی تو یوسفی صاحب کا جملہ ارشاد ہوا کہ جس طرح ہمارے ہاں لوگ کثیر الاولاد ہوتے ہیں ویسے ہی برطانیہ میں لوگ کثیر الولدیت ہوتے ہیں۔ اُن کے آنے پر کلاس جو پہلے محشرستانِ ہاؤ ہو ہوتی بالکل خاموش ہو جاتی لیکن یہ خاموشی اُن کے احترام کی وجہ سے ہوتی۔ وہ ایک Inspiring استاد تھے۔ میں نے لڑکوں کو دیکھا کہ اگر اُن کا کوئی پیریڈ خالی ہوتا تو وہ اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے کے بجائے اُن کے پیریڈ میں آ کر بیٹھ جاتے۔ ایک پروفیسر صاحب نے مجھے بتایا کہ پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو میں اُنھوں نے ایک سوال کا جواب دیا تو ماہرِ مضمون نے کہا کہ ''آپ شاید عابد صدیق صاحب کے شاگرد ہیں۔'' اِس مضمون کے عنوان میں میں نے ابو جان کو ''ہیرا تراش کردار'' اِسی لیے لکھا ہے۔

ابوجان پڑھائی کے بارے میں فرماتے تھے کہ پوزیشن کی نہیں بلکہ پرسنٹیج کی فکر کیا کرو۔ پوزیشن آنے کے بعد یا تو بڑھوتری رک جاتی ہے یا پھر ایک دو سیڑھیاں چڑھنے کی فکر لگ جاتی ہے جب کہ پرسنٹیج میں بہتری لانا ایک مستقل محنت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ پوزیشن لینے میں دوسروں کو نیچا دکھانا بھی چھپا ہوتا ہے جب کہ پرسنٹیج میں اپنی کیفیت میں بہتری لانا منتہائے نظر بن جاتا ہے، جو مثبت فکر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہتر پرسنٹیج بہتر پوزیشن بھی دلاتی ہے۔ ابوجان کی اِس بات نے مجھ میں کمی کو اپنے اندر دیکھنے کا داعیہ پیدا کیا۔

ہمارے کالج کے زمانے میں بالکل آخری دنوں میں طلبہ یونینیں بحال ہوئیں۔ ایک اسلام پسند طلبہ جماعت کے لڑکوں نے اپنے لیٹر پیڈ پر درودِ پاک کو واٹر مارک کرا رکھا تھا۔ ابوجان نے دیکھا تو طبیعت سخت مکدر ہوئی۔ اُن کے بڑوں کو بلایا اور سمجھایا کہ یہ سخت بے ادبی ہے کیونکہ اِس کاغذ پر جو بھی لکھا جاتا ہے وہ درودِ پاک کے اوپر لکھا جاتا ہے اور ٹائپ رائٹر کے حروف درودِ پاک پر ٹھک ٹھک لگتے ہیں۔ یہ بات کچھ ایسی دلسوزی سے کی کہ اُنھوں نے قبول کرلی درحالیکہ اُن جیسے تڑیل اور بدلحاظ لڑکے کم ہی نظر آتے تھے۔

ابوجان نے مجھے نوکری کے آداب بھی سکھائے۔ ایک بار بتایا کہ دفتر جا کر کرسی پر بیٹھنے سے پہلے شکر ادا کیا کرو کہ اللہ نے اپنی مخلوق کی خدمت کے لیے ایک اور دن کام کا موقع دیا ہے، اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی نیت کرو۔ واپس ہوتے ہوئے پھر شکر ادا کرو کہ یہاں بیٹھ کر اللہ کے احکام پورے کیے اور مخلوق کے کام آئے۔ بار بار سمجھاتے کہ مقصد کے لیے کام کرنا چاہیے اور ترجیحات طے کر کے قلیل اور طویل مدتی اہداف کے لیے کام کرنا چاہیے۔ مطامحِ نظر سے نگاہ چوکنی نہیں چاہیے۔ سمادھ لگائے بغیر کوئی مہارت پیدا نہیں ہوتی۔ فرماتے تھے کہ کسی کو کچھ ملتا دیکھ کر للیانے سے آدمی سبک سر اور حقیر ہو جاتا ہے۔ خود وقت کے نہایت پابند تھے اور یہ مجھے بھی سکھایا۔ دفتر سے چھٹی اُنھوں نے بہت کم لی۔ فرماتے تھے کہ چھٹی لینا ملازم کا حق نہیں ہے۔ تبلیغ کے لیے جانا ہے تو دروازہ توڑ کر نہیں جانا۔ اِس بارے میں مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ملفوظ اکثر سناتے کہ جو شخص دنیا جیسی ہلکی چیز کا کام نہیں کرسکتا وہ دین جیسی اعلیٰ چیز کا کام کیسے کرسکتا ہے۔ میری پہلی نوکری لگی تو ایک ریم کاغذ اور بال پائنٹ پنسلوں کی ڈبی لے کر دی کہ اِنھیں اپنی دراز میں رکھوں اور ذاتی درخواست وغیرہ اِن پر لکھا کروں۔ ایک بار میں دفتر

کے ایک فائل کور میں یونیورسٹی کے زمانے کے کچھ کاغذ رکھ رہا تھا تو تنبیہہ فرمائی۔ فرماتے تھے کہ ملازمت کی کلکل اور دفتری کام کے دباؤ کا غصہ گھر والوں پر نہیں نکالنا چاہیے۔

☆.....۳.....☆

میرے ابوجان کا مزاح شستہ اور بامقصد ہوتا تھا۔ مثلاً زبان کے صحیح بولنے برتنے پر وہ ہمیشہ چوکنا رہتے اور ایسی ہر اصلاح عموماً برموقع و برمحل ہی کرتے۔ لیکن اِس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اصلاحِ زبان کے زور میں ابوجان زبان کے فطری پھیلاؤ یا خوبی کا خون نہ کرتے تھے۔ اِس معاملے میں اُن کا منجار جنابِ شان الحق حقی والا تھا کہ جب ہم اردو بول رہے ہوں تو ہمیں اردو ہی بولنی چاہیے، عربی فارسی یا انگریزی نہیں۔ فرماتے کہ اردو میں محبت م پر پیش کے ساتھ کی جاتی ہے جب کہ عربی میں م کے زبر کے ساتھ۔ اور ہمارے ہاں ''بے گُم'' نہیں ہوتی بلکہ ''بے گَم'' ہوتی ہے، یعنی گوند (Gum) کی طرح ساتھ چپکی رہتی ہے۔ (بیگم ترکی الاصل لفظ ہے، ضمہ سوم کے ساتھ)۔ ابوجان بڑے اعتدال کے ساتھ تطہیرِ زبان (Language Purism) کے حامی تھے چنانچہ اُن کے سامنے معجونِ مرکب اردو یا گلابی اردو بولنا ممکن نہ ہوتا تھا۔ فرماتے تھے کہ ہر زبان میں کچھ لفظوں کی ادائیگی مخصوص طریقے اور آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر یہ مخصوص لفظ اپنے صوتی رکھ رکھاؤ کے ساتھ استعمال کرنا سیکھ لیے جائیں تو بولنے کی حد تک اُس زبان یا لہجے پر اچھا عبور ہوسکتا ہے۔ اور اِن الفاظ کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ اپنے دریافت کردہ اِس اصول پر عمل کرتے ہوئے اُنھوں نے کئی علاقائی زبانوں پر قابلِ رشک دستگاہ حاصل کرلی تھی۔ اُنھیں اور ایسے کئی اور لوگوں کو دیکھ کر جنھوں نے مشقت کرکے مادری زبان کے ساتھ کوئی اور زبان یا بولی بولنے/لکھنے کی ایسی صلاحیت پیدا کی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آدمی دِلّی کا روڑا ہوسکتا ہے تو لاہور یا کسی اور شہر کا کیوں نہیں؟

اپنے یونیورسٹی کے زمانے میں ابوجان نے بھرپور زندگی گزاری۔ میں نے بی ایس سی کے امتحانات کی خوب ٹکا کر تیاری کی۔ اِن دنوں مجھے دیکھا کہ میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے پڑھ کر ہلکان ہوئے جاتا ہوں تو فرمایا کہ پڑھائی کو سر پر سوار نہیں کرتے اور کچھ وقت کھیل کود میں بھی لگاتے ہیں۔ بتایا کہ ہم تو اورینٹل کالج میں پرچے سے پچھلی رات فلم بھی دیکھا کرتے تھے: جتنے پرچے اُتنی فلمیں۔ لیکن یہ ضرور دیکھتے کہ کون سی فلم امتحانی نقطۂ نگاہ سے بہتر ہے! ایسے ہی کئی طرح کی شرارتیں اور جاندار مقوی

لطیفے بھی اُن سے منسوب ہیں جو اُن کے ''سلسلۂ عابدیہ'' کے دوستوں میں اب تک چلتے ہیں۔ ایسے دو واقعات ذکر کرتا ہوں جو میں نے خود دیکھے: ایک بار کالج لائبریری میں ایک پستہ قد اور بے حد خوش مزاج پروفیسر صاحب جن کے سر کا بڑا حصہ ''فارغ البال'' تھا، کے پاس جا کر اُن کا سر پکڑا اور اُسے معائنہ کرنے کے انداز میں نہایت سنجیدگی سے گھما گھما کر دیکھتے رہے۔ کئی اور پروفیسر انتظار میں ہیں کہ کیا ارشاد ہوتا ہے۔ اب سرائیکی میں نہایت مدبرانہ انداز میں دریافت فرمایا کہ پروفیسر صاحب کیا آپ کی بیوی چھ نمبر کا جوتہ پہنتی ہے؟ اُنھوں نے حیرت کے ساتھ دیکھا اور ہنکارے۔ فرمانے لگے کہ ہاں میں یہی دیکھ رہا تھا کہ سر کا اِتنا گنج چھ نمبر کے جوتے ہی سے ہوسکتا ہے۔ اب نہ پوچھیے کہ کیسے پوری لائبریری قہقہوں سے بھر گئی۔ اِنہی پروفیسر صاحب نے ایک بار یہیں ابوجان کے مجموعۂ کلام پانی میں ماہتاب کے بارے میں فرمایا تھا کہ شاعری تو اچھی ہے لیکن آپ نے اِس کا انتساب اپنی بیوی کے نام کر کے باقی عورتوں کی حق تلفی کی ہے۔ ابوجان نے نہایت رسان سے سرائیکی میں جواب دیا کہ آپ کو اعتراض ہے تو میں اگلا دیوان آپ کی بیوی کے نام کردوں گا (کُئی ڈرنیں، ولدا دیوان تینڈی زال نے ناں چا کریساں)۔

پسند کی شادی کے بارے میں ابوجان کا ایک مشہور قولِ زریں یہ ہے کہ کافروں میں محبت پہلے کی جاتی ہے اور شادی بعد میں جب کہ مسلمانوں میں شادی پہلے کی جاتی ہے اور محبت بعد میں، اور اُسی سے جس سے شادی کی ہوتی ہے۔ ایک بار میں نے اسلامی شادی نام کی ایک کتاب پڑھی جس میں حضرت تھانویؒ کے مواعظ اور مختلف کتابوں میں سے شادی کے موضوع پر باتیں جمع کی ہوئی ہیں۔ اِس میں ایک بات یہ پڑھی کہ کہیں لڑکا لڑکی میں سلسلہ چل پڑا ہو تو مناسب ہے کہ اُن کی شادی کردی جائے۔ یہ بات بڑی پسند آئی۔ اِسے ابوجان سے ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ میں حضرت تھانویؒ کو بڑا ریجڈ عالم سمجھتا تھا لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ تو بہت روشن خیال آدمی تھے۔ فرمانے لگے کہ شکر ہے کہ حضرت تھانویؒ جناب کے معیار پر پورا اترے اور آپ نے بڑا احسان فرمایا کہ حضرت تھانویؒ کو پاس کردیا۔ تمھاری پسندیدگی کی یہ سند شاید اُنھیں پلِ صراط پار کرا دے۔

قائدِ اعظم یونیورسٹی کے زمانے میں میں نے ایک جذباتی مقصد کے حصول کے لیے بارہ چودہ صفحوں کا آیات و احادیث سے بھرپور ایک ''محبت نامہ'' قسم کی چیز لکھ مارا۔ کچھ میری قسمت ماٹھی

اور کچھ نامہ بر اور مکتوب الیہ کی راجپوتیت، یہ خط پکڑوا دیا گیا۔ اِک مصرع تر کی صورت جو نظر آئی تھی، جاتی رہی۔ میں جو پہلے دل باختہ تھا، اب حواس باختہ ہوگیا۔ کہاں منچلا جا رہا تھا، اب یہ من بیٹھا جا رہا تھا۔ ابوجان کا جملہ مجھ تک پہنچا کہ اِس خط میں چونکہ اردو کی کوئی غلطی نہیں ہے اِس لیے صفوان کو کچھ نہیں کہوں گا۔ ما را ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نہ بود۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کچھ دن بعد فرمایا کہ اِتنے سے کام کے لیے اِتنا لمبا چوڑا خط لکھ کر تم نے لندھور بن سعدان کے گرز سے چیونٹی ماری ہے۔ اگر مجھے کہا ہوتا تو میں یہ ویسے ہی کرا دیتا۔ تمھاری اِس حماقت کی وجہ سے اب یہ نہیں ہو سکے گا۔ پھر کافی عرصے تک مجھے لندھور کا لقب دیے رکھا۔ اِس سے بہت پہلے کی بات ہے کہ میں نے سکول میں دو تین مخچوؤں کی ٹھیک ٹھاک منجی پیڑھی ٹھوکی۔ شکایت ہوئی۔ میں بالکل چوچہ بن گیا جیسے میں نے اُنھیں پہلے دیکھا ہی نہیں۔ اُن دنوں ہم دوستوں نے قسم اٹھانے اور قسم کھانے میں فرق کیا ہوا تھا: قسم اٹھانے کا مطلب واقعی قسم اٹھانا تھا جب کہ قسم کھانے کا مطلب قسم کو کھا پی کر ڈکار جانا تھا۔ چنانچہ جو بھی پوچھتا، میں یہی کہتا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اِنھیں نہیں پھینٹا۔ القصہ ابوجان سکول آئے۔ لڑکوں کے والدین سے معذرت کی اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہا کہ اِس گامے پہلوان کو میں خود سیدھا کرلوں گا۔ گامے پہلوان کا خطاب بھی بچوں میں سے شاید مجھے ہی ملا ہے۔

ابوجان کے کئی چھوٹے چھوٹے فقرے یادگار ہیں۔ ایک بار پوچھا کہ گاڑی اور گدھا گاڑی میں کیا فرق ہوتا ہے؟ ہم منطق چھانٹتے اِدھر اُدھر کی مار رہے تھے کہ فرمایا: گدھا گاڑی میں گدھا باہر ہوتا ہے۔ مُش حکومت کے شروع کے دنوں میں ایک شہر میں بم دھماکہ ہوا اور کسی دوسرے شہر میں اُسی روز جنرل صاحب نے ایک بڑے ثقافتی شو کا افتتاح کیا۔ ابوجان نے بے اختیار فرمایا کہ مشرف نے نیرو کی یاد تازہ کی ہے جس نے روم کے جلتے وقت بانسری بجا کر اصل میں یہ بتایا تھا کہ ملک میں خواہ آگ لگی ہو، ثقافتی سرگرمیوں کو معطل نہیں کیا جا سکتا۔ فوج اقتدار پر قابض ہوئی تو فرمایا کہ Might is right کا ترجمہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس اب پرانا ہوا، اب اِس کے لیے اردو متبادل ہونا چاہیے: جس کی فوج اُس کی موج۔ کوئی خاتون اپنی کسی تکلیف کا للک سے ذکر کرتی تو بڑی سفاک سنجیدگی سے کہتے کہ بی بی یہ بڑھاپے کی علامت ہے، اُس کی تکلیف دوا کے بغیر ہی دنوں دنوں میں دور ہوجاتی۔ ایک بار میں نے کہا کہ پاکستان کے ٹیسٹ کرکٹر عبدالحفیظ کاردار شاید ٹیم میں واحد آدمی ہوں گے جن کے پاس کار ہوگی۔

مسکرائے اور فرمایا کہ پھر تو جو کار خراب ہو اُسے بدکار کہنا چاہیے۔ چائے کی طلب کے لیے اُنھوں نے چہاس کا لفظ گھڑا ہوا تھا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ کو نیکی اور دُم دُم کہتے (اور اِس ''پوچھ'' میں کبھی کبھی غنیت لے آتے: پونچھ)۔ کبھی دال پکتی تو کھانے کے لیے بیٹھتے ہوئے ارشاد ہوتا: اَلدَّالُ یَدُلُّ عَلٰی قِلَّتِ الْمَالِ وَکَثْرَتِ الاَوْلاد، اور خوب مزے لے کر دال کھاتے۔ کبھی کام کی تھکن یا کسل اتارنے کے لیے طویل انگڑائی لیتے ہوئے نعرہ مارتے: یا بابا فرید، رتّاں ڈاڈھیاں تے مرد غریب (''غریب'' میں غ کی بجائے گ، جس سے غربت میں گاڑھا پن پیدا ہو جاتا ہے)۔ اِس کا مطلب ہوتا تھا کہ دو چار منٹ ٹھیکی لیں گے اور گپ شپ لگائیں گے۔ اِس انگڑائی کو وہ ''موجۂ طویل'' کہتے تھے اور اِس کا دورانیہ کوئی ایک ڈیڑھ منٹ کا ہوتا تھا۔

ابوجان تبدیلیِ آب و ہوا کی غرض سے میرے پاس دو بار ہری پور تشریف لائے تو بڑی محفلیں جمتیں۔ میرے عزیز دوست چودھری شبیر احمد بڑی بڑی دیر آ کر بیٹھتے۔ وہ بہت اچھا گا لیتے تھے، خصوصاً ''مائے نی میں کینوں آکھاں.....'' اُن کی پہچان تھا۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی بیٹیاں شیریں اور طیبہ بھی بڑے پیارے ملّی نغمے دوگانی (دوگانا کا ماضی) تھیں۔ ایسی دوگانہاریں میں نے پھر نہیں دیکھیں۔ شبیر صاحب ظرافت کے ماتا تھے اور سنجیدہ ہونا اُنھیں گویا آتا ہی نہ تھا۔ ایک روز کہنے لگے کہ وہ جنت بھی کیا جنت ہوئی جس میں دنیا کی یہی مصیبت خانہ بیوی گلے پڑی رہے۔ جس عورت نے دنیا میں گھر کو جہنم بنایا ہوا ہو وہ جنت میں حوروں کے ساتھ کون سا سلوک سے رہے گی۔ ابوجان نے کہا کہ جنت میں بعض عورتوں کو اُن کے شوہر بطورِ سزا دیے جائیں گے اور بعض شوہروں کو اُن کی بیویاں۔ آسمان شکن قہقہے لگتے رہے لیکن چودھری شبیر اپنی بات پر اڑے رہے کہ جنت انعام کی جگہ ہے اور دنیا والی بیوی کا وہاں ہونا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ اب ابوجان نے کہا کہ جس شوہر کو اپنی بیوی کے ساتھ رہنا گوارا نہیں ہوگا اُسے جنت رسید کرنے سے پہلے شاید جہنم کا ایک جھونٹا لگوا دیا جائے، وہاں سے واپسی پر تو وہ یقیناً Lesser Evil لگے گی۔ اب چودھری شبیر کانوں کو ہاتھ لگاتے رہے۔ مجھے بتاتے تھے کہ آپ کے ابوجان کی اِس بات کے بعد سے میں نے اپنی پہلی بیوی سے بہتر سلوک رکھنا شروع کیا۔

ایک زیرک سیاسی مولانا ابوجان کے شاگرد رہے ہیں جو اپنے والد کی وفات کے بعد بہت جلدی بڑے بن گئے ہیں۔ اسلامی فرنٹ کے دنوں میں یہ ایک بار تشریف لائے اور فرمایا کہ میں صرف

اپنے استاد سے ملنے آیا ہوں۔ ایک نیم مذہبی پریشر گروپ کے کردار پر بات کرتے ہوئے جناب مولانا نے ایک بڑا مزیدار جملہ ارشاد فرمایا: ایجنسیوں نے کچھ پارٹیوں کو دھرنا دینے پر ملازم رکھا ہوتا ہے، جب ضرورت ہوتی ہے اِنھیں ٹچ ٹچ کر کے ہشکار دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے عریض و عمیق جغرافیے کی وجہ سے بڑے بارعب لگتے تھے لیکن میں نے اُنھیں بے حد خوش مزاج پایا۔ ابوجان نے اُنھیں مزاحاً کہا کہ آپ برائکر مولوی ہیں (یعنی جلدی پھول گئے ہیں)۔ امریکہ سمیت کئی بھوکے سیاستدان آپ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ احتیاط کریں کہ کوئی آپ کو ڈکار نہ جائے۔ اِس پر بڑی دیر ہنستے رہے۔ استاد کی نصیحت اور پیغام اُنھیں پہنچ گیا تھا۔

☆.....۴.....☆

تبلیغ سے ابوجان کا گہرا فکری، جذباتی اور جسمانی تعلق تھا۔ بتاتے تھے کہ جب پہلی بار رائے ونڈ گیا (شاید ۱۹۶۶ء) تو ننگے سر تھا اور سفید بشرٹ سیاہ پتلون اور ٹائی پہنے ہوئے۔ چھوٹی مسجد میں چھ آدمی بیان سن رہے تھے اور ساتواں بیان کر رہا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں کا زمانہ تھا۔ پروگرام ظہر پڑھ کر واپسی کا تھا لیکن تین روز مرکز میں رہا، اور پھر پٹھانوں کی ایک جماعت کا امیر بنا کر ایک چلہ کے لیے جہلم کے کسی گاؤں میں تشکیل کر دی گئی۔ فرماتے تھے کہ میں کچھ عرض معروض کرنے لگا تو بھائی غلام مصطفیٰ صاحب نے فرمایا کہ آپ کا مصافحہ ہو چکا ہے، اب ہمت کیجیے۔ بس بھاگم بھاگ کہیں سے کرتہ شلوار مہیا کیے اور روانہ ہو گئے۔ مشتاق حسین فاروقی صاحب سٹیشن تک مشایعت کے لیے گئے۔ مقامِ تشکیل کا نام مجھے بھول گیا ہے لیکن یہ ایک گاؤں تھا جہاں سے کچھ اور گاؤوں میں جانا تھا۔ پہنچے تو گاؤں والوں نے مسجد میں نہ رکنے دیا۔ اب اگلے گاؤں کی طرف چلے تو پہلے گاؤں کے مولوی صاحب نے اپنے بندے آگے بھیج دیے جنھوں نے جماعت کے پہنچنے سے پہلے وہاں جا کر جتھہ بنا لیا اور اِس آتی جماعت پر پتھراؤ کیا۔ سبھی ساتھی لہولہان ہو گئے۔ ابوجان کی بائیں آنکھ کی بھوں کے کنپٹی سے ملتے علاقے پر ایک پتھر لگا جس کا نشان باقی رہا۔ (یہ نشان اُن کو غسل دینے کے بعد قبر میں اتارتے تک چمکتا رہا۔) رات ایک درخت کے ہیٹھ قیام کیا۔ ابھی پو نہ پھٹی تھی کہ وہی مولوی صاحب تین چار گنواروں کے ساتھ آن موجود ہوئے اور لگے معافیاں مانگنے۔ پوچھنے پر بتایا کہ جونہی میں سوتا ہوں، خواب میں میرے پیر صاحب آ کر مجھے جوتیاں مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُن مسکینوں سے معافی مانگ اور اُنھیں

لے کر آ۔ تین چار بار یہی ہو چکا ہے۔ اب میری بیوی نے مجھے دھکے دے کر گھر سے نکالا ہے۔ مجھے معاف کردو اور میرے ساتھ چلو۔ بہرحال کافی فاصلہ طے کر کے پچھلے گاؤں پہنچے تو نماز میں مولوی صاحب نے سب نمازیوں کے سامنے معافی مانگی اور توبہ تلّا کی۔ بتاتے تھے کہ رائے ونڈ مرکز کے پرانے مطبخ کے لیے اینٹیں کوٹنے اور روٹی پچھانے والی جماعت میں شامل رہے۔ ۱۹۹۳ء میں بہاول پور میں تبلیغی اجتماع ہوا تو مولانا محمد احمد انصاری صاحب نے ابوجان کی سرگرمی دیکھ کر فرمایا کہ یہ میدان کا آدمی ہے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے حرکت میں رہنا مشکل ہو گیا تو بھی فکراً پیچھے نہیں رہے۔ وفات سے ایک دن پہلے مسجد بیت المکرّم بہاول پور میں آئی لاہور کے خواص کی ایک جماعت کے ساتھیوں کو روزے کے ساتھ کئی گھنٹے گشت کرایا اور خود اللہ کے راستے میں ایک سال کے لیے جانے کا ارادہ لکھایا۔

جب میں ہری پور میں تھا تو ٹیلی کمیونیکیشن سٹاف کالج سے متصل ایک گاؤں سعید آباد کے ساتھی گشت کرتے ہوئے میرے پاس آئے۔ میں نے حسبِ عادت دفتر کے تقریباً سبھی لوگوں سے ملاقات کرائی۔ اُن میں ایک سیدھا سادا بابا احمد دین تھا جو کہنے لگا کہ میں آج سے تیس سال پہلے سن چوہتر میں بہاول پور گیا تھا تو ایک کالج میں سفید پگڑ لپیٹے ہوئے ایک پروفیسر صاحب نے ہمیں بہت ساتھیوں سے ملوایا تھا اور ہماری بڑی نصرت کی تھی۔ آج کے کالج کے گشت سے مجھے وہ گشت یاد آیا کیونکہ کبھی کسی پروفیسر نے سارا کالج پھر کر گشت نہیں کرایا۔ میرے دریافت کرنے پر اُس نے پروفیسر صاحب کا نام لیا تو میں نے بتایا کہ میں اُنہی کا بیٹا ہوں۔ یہ جملہ سن کر اُس کی جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ کہنے لگا کہ میں آج تک اُن کے لیے دعا کرتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ بہت رویا۔ پھر میں جب تک ہری پور رہا، وہ بندۂ خدا گاہے ماہے مجھے ملنے آتا رہا۔

مجھے زکریا یونیورسٹی ملتان میں داخل ہوئے کوئی ایک مہینہ ہوا ہوگا کہ ابوجان بہاول پور سے شاعروں اور پروفیسروں کی ایک جماعت لے کر صدیقیہ مسجد گلگشت میں تشریف لائے۔ ملتان اور آس پاس کے بہتیرے پروفیسر، شاعر اور موسیقار یہاں جمع ہو گئے اور خوب گہما گہم رہا۔ مجھے ملتان کے تبلیغی بزرگوں عبدالرؤف صاحب، ڈاکٹر عبدالواحد قاضی، بھائی قمر الدین صاحب، پروفیسر میاں عبدالرحمٰن، بھائی اسلام صاحب اور چودھری رفیق صاحب وغیرہ کے ایک طرح سے ''حوالے'' کیا۔ ابدالی مسجد میں آنا جانا شروع ہوا تو حاجی یامین صاحب اور شیخ حبیب صاحب وغیرہ نے کام میں ایسا لگایا کہ باقی ہر

سدھ بسرا دی۔ میں اِسے اللہ کا خاص انعام جانتا ہوں اور ابوجان کی زندہ کرامت۔ اُنھوں نے میرے زمانۂ طالبعلمی میں نہایت دور اندیشی اور سمجھ داری سے میرا پورا ماحول اور اٹھ بیٹھ (Fraternity) تبلیغی بنا دی۔ میری یہی دوستداری آج تک چل رہی ہے اور اِس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ یہی ماحول اور کام میری پہچان ہے کیونکہ لوگ مجھے اِسی حوالے سے جانتے ہیں۔ آدمی ماحول کی وجہ سے چلتا ہے۔ بندہ ماحول سے کٹا نہیں اور گیا نہیں۔ میری دانست میں ابوجان کا مجھ پر سب سے بڑا احسان مجھے اِس ماحول سے جوڑ دینا ہے۔ اللہ اُنھیں بہترین جزائے خیر دے۔ میرا رواں رواں اُن کے لیے دعا گو ہے۔ بحمداللہ یہ نسبت حاصل ہوگئی، اللہ پاک مناسبت بھی دے دے۔ آمین۔

نیز یہ بھی معلوم ہے کہ لاہور فلم سٹوڈیو میں پہلی جماعت میرے ابوجان لے کر گئے تھے۔ اللہ کا کرم ہوا کہ بعد از آں یہاں سے متعلق کئی لوگوں کی زندگیاں بدلیں۔ اِس تبلیغی سفر میں وہ ایک بڑے صاحبِ طرز ایجاد رقاص کے ہاں گشت کے لیے گئے جو لکڑی کی کھڑاویں پہنتے تھے۔ اُن سے ملاقات اور وہاں کی گئی بات کی کارگزاری اُنھوں نے ڈاکٹر محمد حمیداللہ صاحب کو مشافہۃً سنائی جب وہ خطباتِ بہاول پور کے سلسلے میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ یہ گفتگو آج بھی کچھ یوں یاد ہے کہ گانے میں موسیقی اور بولوں کو نماز اور نماز سے باہر کی زندگی کی مثال سے سمجھایا تھا: دن میں پانچ نمازیں اللہ سے کلام یعنی بول ہیں اور نماز سے باہر کی زندگی گویا موسیقی ہے۔ گانے میں موسیقی کی کمپوزیشن ایسے ہوتی ہے کہ آہستہ آہستہ کانوں میں بول پڑنے کی پیاس بڑھتی رہے۔ ایک خاص مقام پر یہ پیاس اِتنی بڑھ جاتی ہے کہ کان بول سننے کے لیے بے تاب ہوجاتے ہیں۔ یہاں موسیقی رک جاتی ہے اور بول شروع ہو جاتا ہے۔ اب بول بھی اِس سجتے انداز اور تکنیک سے بولا جاتا ہے کہ بول کے ختم ہوتے موسیقی کے اگلے دور کی پیاس بڑھتی جاتی ہے۔ ایک خاص مقام پر آکر یہ پیاس اِتنی شدید ہوجاتی ہے کہ مزید بول سننے کا یارا نہیں رہتا اور موسیقی کے اگلے دور کا آغاز ہوجاتا ہے۔ موسیقی کا یہ دور بھی پچھلے دور کی ایسے کمپوز ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ اگلے بول کے لیے پیاس بڑھاتا جائے۔ چنانچہ اِس طرح ایک گانے میں تین، چار یا پانچ دور موسیقی کے آتے ہیں اور اِتنے ہی بولوں کے۔ بس ایسا ہی کچھ نماز اور روزمرہ کی باقی زندگی میں ہوتا ہے۔ جب آدمی نماز سے باہر ہے تو اُس کی زندگی ایسے گزرے کہ نماز کا وقت آنے کی پیاس بڑھتی چلی جائے۔ نماز کا وقت آتے تک یہ پیاس اِتنی شدید ہوجائے کہ یہاں

وقت داخل ہو اور یہ اللہ کا بندہ اپنی اب تک کی کارگزاری سنانے کے لیے اللہ کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ اب نماز میں اللہ سے گفتگو چل رہی ہے اور نمازی اِس کا حظ اٹھا رہا ہے (اور بہترین نماز وہ ہے جس میں آدمی کو یہ کیفیت حاصل ہو کہ وہ اللہ کو گویا دیکھ رہا ہے)۔ اب بول جوں جوں ختم ہوتا جاتا ہے، نماز سے باہر کی زندگی میں اِس نماز سے حاصل ہونے والی کیفیت کے ساتھ لگنے کی پیاس بڑھتی جاتی ہے۔ اور جونہی یہ بول یعنی نماز ختم ہوتی ہے، نماز سے باہر کی زندگی میں اللہ کے احکامات کے مطابق لگنے کا والہانہ داعیہ پیدا ہو چکا ہوتا ہے اور آدمی دنیا کے کاموں میں اِس حاصل شدہ کیفیت کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ نماز کی بہترائی سے نماز سے باہر کی زندگی بہترین بنے گی، اور نماز سے باہر کی زندگی کی اچھائی سے نماز بہترین ہوگی۔ یعنی جتنی موسیقی اچھی اُتنا بول بھی اچھا۔ دن میں پانچ بار اللہ سے ہمکلامی اور نماز سے باہر کی زندگی کی کارگزاری اللہ کو خود پیش کرنا اگر اللہ کی حضوری کے احساس کے ساتھ ہے تو کیا ہی کہنے۔ چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں اِسی لیے عطا ہوئی ہیں کہ بندے کا کوئی لمحہ اللہ کی یاد یا اللہ سے ہم کلامی کے شرف سے خالی نہ گزرے۔ پوری زندگی اِس طرح گزرے کہ بندہ یا تو اللہ کی یاد میں ہو یا اللہ سے ہم کلامی کی حالت میں ہو۔ اور اِسی لیے یہ ارشاد ہوا ہے کہ وہ شخص ہلاک ہو گیا جس کے دو دن ایک جیسے گزرے، یعنی ہر آنے والا دن حضوری و ہمکلامی کی کیفیت کے اعتبار سے پچھلے دن سے بہتر ہونا چاہیے۔ المختصر اللہ کی توفیق سے وہ صاحب جماعت والوں کے پاس مسجد تشریف لے آئے، اور بتایا کہ میں ۳۷ سال کے بعد مسجد میں آیا ہوں۔ ابو جان جب کبھی یہ کہتے کہ تبلیغ کے کام میں سوائے مردم بیزار آدمی کے ہر شخص لگ سکتا ہے خواہ وہ تھیٹر کا نچنیا ہی ہو، مجھے یہ گفتگو اور مرحوم ڈاکٹر محمد حمید اللہ یاد آجاتے تھے۔

شروع شروع میں ابو جان جب تبلیغ کے سفر سے واپس آتے تو سر پر بڑا سا خاکی بستر بند ہوتا جس کے ایک طرف سلور کا لوٹا لٹک رہا ہوتا تھا، اور ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ۔ ہم اِس ڈبے کا انتظار کرتے۔ اُن کی یہ عادت اِتنی پختہ تھی کہ ملتان کے اِس تبلیغی سفر سے واپسی پر مجھے بھیج کر مٹھائی منگوائی کہ بہاول پور لیتے جائیں۔

ہم ایک بار مولانا سعید احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عمومی مجمعے کے بیان میں بیٹھے تھے۔ بیان کا خاصا حصہ گزر گیا تو ہمارے ساتھ آئے ہوئے ایک سادہ خیال ساتھی نے کہا کہ ابھی تک

مولانا نے مقصد کی بات شروع نہیں کی۔ مولانا کے بیان کی بے اِکرامی پر ابوجان کو سخت تکلیف ہوئی۔ کچھ دیر بعد مجھے فرمایا کہ کمی تو میرے اندر تھی کہ اپنے ساتھیوں کو یہ نہ بتا سکا کہ ترغیبی بات بھی مقصد کے حصول کے لیے ہوتی ہے اور برابر کا اجر رکھتی ہے۔ ابوجان تبلیغ میں صرف مقصد کی بات کرنے اور اِدھر اُدھر کی کوئی بات نہ کرنے پر بے حد زور دیتے۔ فرماتے تھے کہ ہر دینی بات دعوت نہیں ہوتی۔ لوگوں کو ہم دعوت سیکھنے کے لیے بلاتے اور نکالتے ہیں لہٰذا ہمیں صرف دعوت ہی کی بات کرنی چاہیے۔ دعوت کی بات صرف یہیں ملتی ہے، باقی دینی باتیں کہیں بھی مل سکتی ہیں۔ کئی بار اِس موضوع پر بھی بات ہوتی کہ دعوت میں ایک ہی بات کیوں کی جاتی ہے۔ ایک بار سمجھانے کے لیے فرمایا کہ اذان چودہ سو سال سے ایک ہی ہے اور کبھی نہیں بدلی۔ ایسے ہی دعوت کے بول ہیں۔ اذان مکمل ترین دعوت ہے۔ اذان سے بہترین عبادت کے لیے بلایا جاتا ہے، دعوت سے بہترین امت ہونے کی شرط پوری ہوتی ہے۔

ابوجان مجھے تبلیغ میں نکلنے کے آداب بتاتے رہتے۔ فرماتے تھے کہ جہاں بھیج دیا جائے، جس کے ساتھ بھیج دیا جائے اور جتنے وقت کے لیے بھیج دیا جائے، چلے جاؤ۔ فرماتے تھے کہ تبلیغ میں دور تک اور موت تک چلنے کا طریقہ یہ ہے کہ سر جھکا کے پیچھے پیچھے چلتے رہو اور اپنی قربانی کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہ ہونے دو۔ میں مارے بغیر آدمی تبلیغ کا کام نہیں کرسکتا۔ فرماتے تھے کہ اپنی ذات کو نشانہ بنا کر دعوت دو۔ اپنا بننا اصل ہے۔ جو آدمی دوسروں کی اصلاح کی نیت سے تبلیغ کا کام کرتا ہے وہ تبلیغ میں مہمان ہے اِس لیے کہ اُسے دوسروں پر غصہ آتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ کلمہ گوؤں کی بے اکرامی کرتا ہے۔ فرماتے تھے کہ جو آدمی تبلیغ میں ترتیب اور یکسوئی کے ساتھ لگا رہے اور کمائی اور معاملات پر نگاہ رکھے وہ بڑے بڑے عاملوں سے زیادہ قوتیں حاصل کرلیتا ہے اور بڑے بڑے عامل اُس کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ فرماتے تھے کہ جو معاملے کا خراب ہے اور جنت کے خواب دیکھتا ہے اُس سے بڑا احمق کوئی نہیں۔ اکثر فرماتے تھے کہ عمومی بنو اور خصوصی نہ بنو، اور مت بھولنا کہ ہمارا کام گلی گلی لوگوں کے پیچھے پھر کر دعوت دینا ہے۔ فرماتے تھے کہ اللہ سے ڈرانے کی بجائے اللہ کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور لوگوں کو دین کی دی ہوئی گنجائشوں کا بتانا چاہیے۔ فرماتے تھے کہ کامل مرشد وہ ہے جو مرید کو صرف آنکھیں بند کرکے توجہ نہ دے بلکہ آنکھیں کھول کر ہدایت دے، چنانچہ تبلیغ کا کام بہترین مرشد ہے۔ فرماتے تھے کہ تبلیغ کا کام بہترین اور کامل سلوک ہے کیونکہ اِس میں جلوت اور خلوت دونوں

کی تربیت کی جاتی ہے: جلوت میں دعوت دی یا سنی جائے اور خلوت میں ذکر کیا جائے۔ فرماتے تھے کہ جو آدمی تبلیغ کے کام میں اِن دونوں حالتوں کی صحیح تربیت پالے وہ اِن شاء اللہ کہیں بچل نہیں سکتا۔ جب وہ لوگوں کے سمندر میں ہوگا تو دعوت میں لگا ہوگا اور جب تنہا ہوگا تو ذکر و دعا میں لگا ہوگا۔ جن لوگوں میں اِس دوہری تربیت کی بجائے اکہریت ہوتی ہے یعنی وہ یا تو صرف تقریر کے آدمی ہوتے ہیں یا صرف خانقاہی ذکر کے، وہ اپنا ماحول بدل جانے سے انتشار کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ذکر کے منتہی کو خراب کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اُس کی تنہائی ختم کردی جائے، وہ چند دنوں میں سب کیفیات کھو بیٹھے گا۔ اِسی طرح تقریر کے شہسوار کو مجمع سے دور کرکے کچھ عرصہ تنہائی میں رہنے پر مجبور کردیا جائے تو وہ بھی اپنی مایا سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ فرماتے تھے کہ تبلیغ میں لگو لیکن ذکر اور علم کی خفت کو دل میں نہ آنے دو۔ تزکیہ، علم اور تبلیغ تینوں میں سے ہر ایک بقیہ دونوں کی کمک پر ہے۔ جو آدمی علم میں لگ کر ذکر کی تخفیف کرتا ہے وہ علم کے تکبر میں مبتلا ہے۔ جو ذکر میں لگتے ہوئے علم کو ہلکا جانے وہ جاہل صوفی ہے۔ اور جو تبلیغ میں چلتے ہوئے علم و ذکر کی کمی کرتا ہے وہ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں آوارہ گرد ہے۔ لہٰذا تبلیغ میں چلتے ہوئے علماء اور اہلِ نسبت دونوں طبقوں سے راہ و رسم رکھو، اور اِسے اپنی ذاتی ضرورت سمجھتے ہوئے رکھو۔

فرماتے تھے کہ تبلیغ کے کام کا اسمِ اعظم انسانیت سے محبت ہے۔ مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور انسان کائنات کا دلھا ہے۔ انسان کی قدر اور مسلمان کے اکرام نے تبلیغ والوں سے وہ کام کرا لیے ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔ کیا کہیں سوچا جاسکتا ہے کہ ملک کا صدر (ڈاکٹر ذاکر حسین) ایک تانگے والے کے پاس تبلیغی گشت کے لیے گیا ہے، اور اِس دعوت دینے کو اپنی ذاتی ضرورت اور اللہ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری سمجھتا ہے؟ فرماتے تھے کہ کسی ملک یا قوم کو مردہ باد نہیں کہنا چاہیے۔ زندہ باد مردہ باد کے نعرے لگانے یا قانون بنانے سے دین نہیں آئے گا۔ فرماتے تھے کہ مسلمان کی کمی اسلام کی کمی نہیں ہے۔ بہت کم مسلمان ملیں گے جن کا طرزِ زندگی شریعت یا اسلامی آداب وقوانین سے پورے طور پر میل کھاتا ہو۔ مسلمانوں میں اسلامی صفات پیدا کرنا ایک مستقل کام ہے جسے محبت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اٰمِنُوا میں اِسی کی ترغیب ہے۔ فرماتے تھے کہ جو اعتراض کرے اُسے جواب نہ دو بلکہ اُس کے لیے اللہ سے مانگو اور کسی حیلے سے اُسے ماحول میں لے آؤ، ماحول کی برکت سے وہ بات

سمجھ میں آتی ہے جو الگ بٹھا کر سمجھانے سے نہیں آتی۔ فرماتے تھے کہ تبلیغ کا مخالف کوئی نہیں ہے۔ جو لوگ مخالفت کرتے ہیں وہ کام سے نہیں کام کرنے والوں سے مخالفت رکھتے ہیں۔ اختلاف کام سے نہیں کام کے کرنے والوں سے ہے۔ کام کرنے والوں میں جوں جوں نبوی اخلاق اور شخصی و دعوتی خوبیاں آتی جائیں گی، لوگوں کے اختلافات اِن شاء اللہ دور ہوتے جائیں گے۔ اللہ کام کی اور کام کرنے والوں کی حفاظت کرے۔

اِسی طرح مجھے بزرگوں سے ملنے کا طریقہ بتایا۔ فرماتے تھے کہ تبلیغی اکابر اجتماعی کام میں لگے ہوئے ہیں، اُن سے انفرادی وقت نہیں لینا چاہیے۔ اِس سے جہاں امت کا نقصان ہوتا ہے وہاں اُن کی فکر بھی بٹتی ہے۔ بس ترتیب سے کام میں لگ جانا چاہیے۔ امت میں ایسے لوگ ہیں ہی کتنے جو صرف اور صرف امت کی سوچتے ہوں۔ اُن کا بہت سے بزرگوں سے تعلق تھا اور کتنے ہی اکابر کی باتیں مجھے بتایا کرتے تھے: بھائی شفیع قریشی صاحب، بابو بشیر صاحب، بھائی عبدالوہاب صاحب، مولانا سعید احمد خاں، مفتی زین العابدین صاحب، مولانا محمد اسلم، مولانا محمد احمد انصاری، مولانا جمشید علی خاں، ابراہیم عبدالجبار صاحب، مولانا محمد اشرف، ڈاکٹر محمد نواز، ڈاکٹر عبدالواحد قاضی، ڈاکٹر محمد طیب، ڈاکٹر احمد کمال انصاری، مولانا عبدالعزیز دعاجو، بھائی جنگ شیر صاحب، وغیرہ۔

میں نے بیعت کے سلسلے میں ابوجان سے پوچھا تو فرمایا کہ یہ مشورہ میری بجائے تبلیغی اکابر سے کرو کیونکہ بیعت زندگی بھر کا اور خالص ذوقیات کا معاملہ ہے۔ مثال سے سمجھایا کہ گھڑی میں گھومنے والی گراریوں کی سمت اِدھر اُدھر ہوتی ہے لیکن اِس اختلاف ہی کی وجہ سے یہ گراریاں سوئیوں کو درست سمت میں حرکت کراتی ہیں، اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ گراریاں محور کی وحدت سے آزاد نہیں ہوتیں۔ بیعت یہی محور ہے۔ بس کوشش کرنی چاہیے کہ دسراتھ یا انتشارِ فکر و توجہ نہ ہو اور آدمی تھان بندھا رہے۔ میرے اصرار پر بھی یہی فرمایا کیے کہ بیعت کے بارے میں خود فیصلہ کرو اور لائی لگ نہ بنو، بیعت مارے باندھے کا سودا نہیں اپنی خوشی کی بات ہے۔ البتہ دعا کرتے رہے کہ میں کسی قطاع الطریق کے دوالے نہ ہولوں۔ اُن کے مشورے سے میں نے مفتی زین العابدین صاحب اور مولانا محمد احمد انصاری صاحب کو رہنمائی کے لیے خط لکھے۔ ہر دو حضرات نے حضرت جی مولانا محمد انعام الحسن کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی رائے مرحمت فرمائی، چنانچہ میں نے نومبر ۱۹۹۲ء میں حضرت جیؒ کی بیعت کی۔ ابوجان کو

بہت نچنتائی ہوگئی۔ بعد ازاں مجھے حزب البحر کی اجازت خود عطا فرمائی اور پھر مولانا محمد احمد صاحب سے دلوائی، اور خود اپنی نگرانی میں پروفیسر ظفر احمد چودھری صاحب کے ہمراہ اِس کی زکوٰۃ دلوائی۔

میرے ابوجان کو حدیثِ پاک کی اجازت مولانا عبدالرشید نعمانیؒ اور مولانا لطافت الرحمٰنؒ سے ملی۔ مجھے اُن کے دلائل الخیرات کے ذاتی نسخے پر میرہ (اوگی، مانسہرہ) کے مفتی محمد خلیل الرحمٰن سے حزب البحر کی اجازت لکھی ملی ہے جو یکم شوال (عیدالفطر) ۱۳۹۲ھ (۷/نومبر ۱۹۷۲ء) کی ہے۔ اغلب ہے کہ یہ اجازت کسی تبلیغی سفر کے دوران میں ملی ہوگی۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اُنھیں پوسٹ کارڈ لکھ کر طلب کیا تھا جس کا یہ جملہ مجھے یاد ہے: ''ہم چراغِ سحری ہو چکے، آؤ اور اپنا حصہ وصول کرلو۔'' یہ گئے اور خانقاہ میں تین دن رہے۔ حضرت رائے پوریؒ نے بیعت فرمایا اور واپسی پر دیر تک سینے سے بھینچے رکھا۔ اِسی طرح اُن کے نام شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے دو پوسٹ کارڈ بھی میں نے دیکھے ہیں (جو مولانا محمد احسان الحق صاحب کے تحریر کردہ تھے)۔ مولانا خان محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کی وفات پر خط لکھ کر تعزیت فرمائی۔ وہ حضرت رائے پوریؒ سے تعلق، دیوبندیت اور مجلسِ صیانۃ المسلمین وغیرہ کے رنگوں میں رنگے ہوئے تھے لیکن میں اُنھیں کھلا دیوبندی نہیں کہہ سکتا۔ وہ بغیر کسی سابقے یا لاحقے کے صرف مسلمان تھے۔ ایک بار میں تبلیغ کو دیوبندیت کی شاخ بتانے لگا تو بڑے طریقے سے سمجھایا کہ تبلیغ کا مطلب دیوبندیت نہیں ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے اُسے تبلیغی مزاج کی ہوا بھی نہیں لگی۔ فرمایا کہ مولانا محمد الیاسؒ نے کسی کو اپنا خانہ بدلنے کی دعوت نہیں دی بلکہ اپنی جگہ پر رہتے ہوئے تبلیغ میں نکلنے کے لیے وقت فارغ کرنے کی دعوت دی ہے۔ اُنھوں نے مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی وغیرہ کو وقت لے کر آنے کو کہا اور اُن کی صلاحیتوں کو استعمال کیا۔ مولانا محمد الیاسؒ نے اِس کام میں ہر ایک کے لیے راستہ کھلا رکھا ہے۔ تبلیغ والے امت بنا رہے ہیں۔ تم بھی امتی بنو امتی، اور امت بناؤ امت!

☆.....۵.....☆

میرے ابوجان کی زندگی حقیقی معنوں میں کھلی کتاب تھی اور ہر طرح کے اینچ پینچ سے خالی۔ وہ وہی کرتے تھے جو ٹھیک سمجھتے تھے اِس لیے کسی پردہ پوشی کی ضرورت نہ تھی۔ جس بات پر کسی نے جائز انگلی رکھی، اُنھوں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اُس کا اعتراف کرلیا۔ وہ دائرہ صفت مزاج کے آدمی بالکل

نہ تھے۔ فرماتے کہ سچ بولنے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو یہ یاد نہیں رکھنا پڑتا کہ کس موقع پر کیا بات کہی تھی۔ حساب کتاب کے بہت پکے اور لین دین کے نہایت کھرے بلکہ کھرتل تھے۔ حافظے کو کاغذ سے قوت دینے کی حدیثی ترغیب کو ہمیشہ پیشِ نگاہ رکھتے۔ اُنھوں نے اپنی تنخواہ کی پہلی پے سلپ سے لے کر آخری تک ترتیب سے اور اکٹھی باندھ کر رکھی ہیں۔ دینے دلانے اور معاملات صاف رکھنے میں مجھے دور دور تک اُن جیسا کوئی نظر نہیں آتا۔ فرمایا کرتے تھے کہ میرے بعد کوئی دینے والا تو آسکتا ہے لینے والا کوئی نہیں آئے گا۔ اُن کی وفات کے بعد عید کے روز ہم نے صدقۂ فطر دیا تو قاری صاحب نے بتایا کہ آپ لوگوں کا فطرانہ آچکا ہے۔ آپ کے ابوجان ہر سال پہلی تراویح کے بعد فطرانہ دے دیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے رسید دکھائی جس سے معلوم ہوا کہ یکم رمضان کو وہ اپنے پوتے پوتی سمیت سب کا فطرانہ ادا کر چکے ہیں۔ (یاد رہے کہ یہ پوتا پوتی ہری پور میں تھے۔) میں اعتراف کرتا ہوں کہ جہاں شرعاً دینے کا کوئی معاملہ پڑتا ہو، ایسا دور اندیش آدمی مجھے کسی کتاب میں بھی نہیں ملا۔ وہ انتہائی دیانت دار آدمی تھے لیکن دیانت کی ڈھنڈورچی نہ کرتے۔ آج چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے اپنے بیٹے کے خلاف ازخود نوٹس لے کر خود کو سماعت بنچ سے علیحدہ کر کے تاریخ ساز مثال قائم کی تو مجھے یاد آیا کہ جب میرے ابوجان اسلامیہ یونیورسٹی کے خفیہ پریس کے انچارج تھے اور میرے بی ایس سی کے امتحانات قریب تھے تو اُنھوں نے میری صرف ایک امتحان والی ٹرم کے لیے نہیں بلکہ پورے ایک سال کے لیے یہ عہدہ چھوڑ دیا تھا۔ کسی مسجد میں جاتے تو وہاں کی ضروریات کے استعمال کا معاوضہ دیتے۔ میں نے اُنھیں گزرگاہ کی ہر مسجد میں ایسا کرتے دیکھا۔ خصوصاً سفر میں مسلک کی مسجد بالکل نہ ڈھونڈتے۔ مسجد میں چندے کا کپڑا پھیرنے کے سخت خلاف تھے۔ ایک بار مسجد میں اُن کا جوتہ تبدیل ہوگیا۔ یہ چھوڑا گیا جوتہ اُنھوں نے نہ پہنا بلکہ گھر سے دوسرا منگوایا، کہ اِس کا پہننا جائز نہیں۔ اللہ نے اُن پر وضو کی مشقت آسان کردی تھی؛ وہ ہمیشہ باوضو رہتے اور وضو کو اپنا ہتھیار کہتے تھے۔ اُن کی وفات سے ذرا پہلے گھر کی توسیع کا کام شروع کرایا گیا۔ شدید ابتری تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُنھیں چائے تک کے لیے مشکل ہو رہی ہے تو ایک بار اسلام آباد سے آتے ہوئے اُن کے لیے بجلی والا تھرموس لے آیا۔ قبول فرمایا اور کہا کہ بیٹے اب اِن چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے نوکری کے پیسوں سے اِس تھرموس کے علاوہ اُنھوں نے کبھی کوئی چیز نہیں لی۔ میں جب بھی ہری پور سے آیا یا اُنھوں نے کسی کام سے بلایا، تو واپسی

پر ہمیشہ ڈیڑھ یا دو ہزار روپے دیتے کہ یہ تمھارا آنے جانے کا کرایہ ہے۔ میں اِس پر ہمیشہ انقباض کا اظہار کرتا۔ پھر میں نے یہ کرنا شروع کیا کہ واپسی کے لیے ایسے وقت میں نکلتا کہ ابوجان سے سامنا نہ ہو۔ اب اُنھوں نے مجھے یہ پیسے منی آرڈر کرنا شروع کر دیے۔ ایک مجھی پر موقوف نہیں، وہ جنھیں بلاتے اُنھیں سفر خرچ دینے کی لٹک اُن میں ہمیشہ چلی جاتی تھی۔ آپ اِسے اُن کی عادت یا فطرتِ ثانیہ کہہ سکتے ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار چاچا جی شاہد کو بلایا تو واپسی پر اُنھیں چھ سو روپے دیے (وہ مظفر گڑھ سے آئے تھے) جس پر وہ خاصے ناراض ہوئے۔ ایک بار خاندان کے کافی سارے لوگوں کو بلایا تو سبھی کو یہ ہدیہ دیا۔ (یہ دونوں باتیں مجھے چاچا جی شاہد اور اورنگ زیب بھائی جان نے بتائیں)۔ مجھے آخری بار کالج لے کر گئے تو لائبریری کا کھاتہ کلیئر کرانا تھا۔ ایک کتاب واپس کی۔ سجاد رموز صاحب نے کہا کہ آپ آتے رہیے ہم خدمت کرتے رہیں گے۔ فرمایا اب اِس کی ضرورت نہیں۔ اپنے کفن دفن تک کے لیے پیسے اٹھا رکھے تھے کہ آنکھ بند ہوتے ہی سب مال ترکہ بن جاتا ہے جس سے کفن دفن اور متعلقہ امور کے لیے پیسے نہیں نکالے جا سکتے۔

اُنھیں وفات سے ایک روز پہلے پنشن اور جی پی فنڈ ملا تھا۔ اُسی دوپہر گھر کی توسیع کا آخری بل دے کر مستری مزدور فارغ کیے اور رات مجھے فون پر بتایا کہ فلاں کا اِتنا فلاں کا اِتنا۔ میں نے کہا کہ آپ کے اپنے لیے تو صرف ریزگاری ہی بچ رہی ہے۔ فرمایا کہ مجھے اب ضرورت نہیں رہی ہے۔ عرض کیا کہ آدمی بیمار و بیمار ہی ہو جاتا ہے اور آپ کی تو صحت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ میں اب اپنے علاج پر پیسہ لگا کر تم لوگوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے کچھ تا نا ری ری کی تو فرمایا کہ کوئی بات نہیں تمھارے پیسے بھی تو میرے ہی ہیں۔ پھر فرمایا کہ میں آج دوپہر ایک سال کے لیے اللہ کے راستے میں نکلنے کا ارادہ کر چکا ہوں اِس لیے اب تو بالکل بھی حاجت نہیں۔ القصہ جیسی بے ہمہ و باہمہ زندگی اُنھوں نے گزاری اور جس صاف ستھرے انداز میں وہ گئے ہیں اُسے دیکھ کر تو مجھے علامہ اقبال یاد آتے ہیں کہ گھر میں رہتے ہوئے گھر کا کرایہ دیتے تھے اور لباس تک عاریۃً پہن رہے تھے۔

میرے ابوجان نے بے حد نفیس طبیعت پائی تھی اور نہایت صاف ستھرے رہتے تھے۔ خوش نشینی کے لیے لمبے چوڑے گھر اور سامانِ آرائش کی بجائے سادگی اور نزاہت و نظافت اُنھیں طبعًا پسند تھی۔ جمعے کی تیاری وہ عام طور سے جمعرات کے دن کرتے۔ ہم نے غسل دیتے وقت اُن کے بدن پر

میل کا ایک ذرہ نہ پایا۔ گرمیوں میں خس اور سردیوں میں عود استعمال کرتے۔ اُن کا کمرہ اور سبھی چیزیں اِن خوشبوؤں سے مہکی ہوتی تھیں۔ وفات کے بعد اُن کی الماری میں سے سالوں تک یہ مخصوص مہک آتی رہی۔ مجھے اپنے بچپن میں اُن کا کان میں لخلخہ لگانا بھی یاد ہے۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ وہ کچھ دیر کے لیے کہیں ٹھہرتے تو بعد میں آنے والوں کو پتہ چل جاتا تھا کہ یہاں سے ہوکر گئے ہیں۔ پارکر کوئنک بلیو بلیک اِنک استعمال کرتے تھے؛ اور جب یہ بازار میں ملنا بند ہوگئی تو پیلیکن رائل بلیو پر آگئے۔ بڑی مدت تک برطانیہ سے آنے والا جیسمین کا قہوہ استعمال کرتے رہے۔ پارکر، شیفر اور ایک اور روایتی قیمتی پین جس کا نام بھول رہا ہوں، استعمال کرتے تھے۔ بڑے تایا جان کی میٹرک پاس کرنے پر دی ہوئی اومیگا گھڑی بڑی دیر تک اُن کے پاس رہی جو آخرالامر ایک ڈاکو نے اُن سے چھینی۔ ایک آدھ سال ایسا گزرا کہ جناب جمیل چودھری اور ڈاکٹر شفیق احمد صاحب وغیرہ کے ساتھ ہاکی، فٹ بال، کرکٹ، ریسلنگ اور نیشنل جیوگرافک چینل کے ساتھ ساتھ پکے راگ بڑے شوق سے دیکھتے رہے۔ ویسے ٹی وی سکرین سے اُنھیں طبعًا تکدر تھا۔

جوانی میں ڈنٹر پیلنا، مگدر ہلانا اور باقاعدہ پہلوانی کی ساری منازل طے کیں۔ میراتھن میں بھی حصہ لیا۔ آخرِ عمر میں جسم ڈھلک گیا تھا۔ فرماتے تھے کہ پہلوان کا بڑھاپا عبرت ناک ہوتا ہے۔ اپنی صحت کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ ذیابیطس ہوئی تو بقیہ تمام عمر پھیکی چائے پی۔ ایک بار چائے کے ساتھ کہیں گلاب جامن کھا لیا تو ہم نے بڑی دیر تک یہ مذاق بنائے رکھا کہ ابوجان پرہیز سے پرہیز کرتے ہیں۔ اپنی ایسی کبھی کبھی کی بدپرہیزیوں پر خوب مزاحیہ جملے کہتے۔ فرماتے تھے کہ جسم اللہ کی نعمت ہے۔ اِس کی راحت کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو آخری عمر دوسروں پر بوجھ بن کر گزرتی ہے۔ رذالتِ عمر اور سوءِ کبر سے وہ اللہ کی پناہ مانگتے تھے۔ میں نے اُن کی اِس دعا کو حرف حرف قبول ہوتے دیکھا: آخری سانس لیتے ہوئے وہ خود زمین پر بیٹھ گئے لیکن کسی کا سہارا نہ لیا۔ اُنھوں نے پس ماندگان کو ایک غسل اور تکفین و تدفین کی تکلیف کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں دی۔ وہ کبھی کبھی یہ (یا اِس سے کچھ ملتا جلتا) شعر پڑھا کرتے تھے (جس کے بارے میں معلوم نہ ہوسکا کہ کس کا ہے):

تمام عمر اِسی احتیاط میں گزری
کہ آشیاں مرا شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

اللہ نے لاج رکھی۔ اُن کا گھر یا گھرانہ تو کسی پر کیا بار ہوتا، اُن کا جسم تک ایک لمحے کے لیے کسی پر بار نہ ہوا۔ زندگی میں برکت اور صحت میں برکت اِسی چیز کا نام ہے کہ جتنی زندگی اللہ کے ہاں سے مقدر ہے، تندرستی کے ساتھ گزر جائے اور چلتے پھرتے موت آجائے اِس سے پہلے کہ لوگ اوازار ہو جائیں۔

ابوجان صاف دل اور صاف گو آدمی تھے اور حقوقِ انسانی کی ادائیگی کے معاملے میں نہایت چوکس۔ ایک بار میں نے اونچے سُروں میں قاضی حسین احمد صاحب کی غیبت کی تو مجھ سے خط لکھوا کر معافی منگوائی۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں خوش اور اُن کے متلاشی رہتے۔ زندگی کی لازمی تلخیاں اُنھوں نے بڑے حوصلے سے بتائیں اور کئی موقعوں پر آفات کو مواقع میں بدلا۔ مزاحًا کہا کرتے تھے کہ زندگی جلیبی کی طرح ہے، ذائقے میں نہیں گزارنے میں۔ اپنے کام حتی الامکان خود کرتے۔ دوسروں کو حتی الوسع تکلیف نہ دیتے۔ جب تک سگریٹ نہ چھوڑی تھی تب بھی ایک طرف جا کر پیتے تاکہ دھوئیں اور بو سے لوگ تنگ نہ ہوں۔ کبھی شام کو بیٹھک میں نہ ہوتے تو ہم کہتے کہ ابوجان باہر نکل کر پرہیز کر رہے ہیں۔ (یہ اِس لیے کہ ڈاکٹر نے سگریٹ سے پرہیز بتایا تھا۔) نماز کے نہایت سختی سے پابند تھے۔ عید کی نماز کے لیے آنے اور جانے کے الگ الگ راستے کی سختی سے پابندی کرتے۔ دوسروں کی چیزیں استعمال کرنے سے بچنے کی تلقین کرتے۔ رخصت کی بجائے عزیمت پر چلتے۔ اختلاف رکھتے ہوئے دوسروں کو اختلاف کا حق دیتے۔ حق گو اور راست باز تھے اور دین کی قدیمی روایت سے کاملًا پیوستہ، لیکن آج کی معروف صحافتی اصطلاحات کے مصداق انتہا پسند یا بنیاد پرست نہیں تھے اور نہ ہی روشن خیال۔ اُن کے رجحانات تعمیری اور مخلصانہ تھے۔ بڑے کڑے وقت بھی آئے لیکن اِس نیک معاش غیرت کے پتلے نے کبھی کسی کا احسان نہیں اٹھایا۔ وہ صحیح لفظی اور محاوراتی معنی میں خود ساختہ و خود پرداختہ (Selfmade) آدمی تھے۔

ابوجان کی وفات سے پہلے میں آخری بار آیا تو ایک صبح شدید سردی میں مجھے اسلامیہ یونیورسٹی کے خفیہ پرنٹنگ پریس لے گئے اور اپنا کمرہ دکھایا جہاں بیٹھ کر رات دن یونیورسٹی کی سیکریسی برانچ کا کام کرتے تھے۔ یہاں سے سردیوں میں رات بارہ بجے گھر آنا اور صبح چار بجے پھر پہنچ جانا مجھے یاد ہے۔ میں دیکھتا رہا کہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ بیٹا دیکھو کس مشقت سے تمھارے لیے جمع جتھا کر کے ایک گھر بنایا ہے۔ گھر کا خرچ چلانے کے لیے اُنھوں نے ایک وقت میں چار چار کام کیے:

کالج کی نوکری، یونیورسٹی کے خفیہ پریس کی نوکری، ہومیوپیتھی کلینک اور قواعد کی درسی کتابیں لکھنا۔ سُستی کا لفظ اُن کی لغت سے خارج تھا۔ مجھے یہ بھی یاد آتا رہا کہ جس دن یہ گھر لیا تھا اُسی دوپہر جا کر موٹر سائیکل خریدی تھی۔ یہ ساختہ جاپان نیلے رنگ کا ۱۰۰ سی سی یاماہا ۹۳۰۰ روپے کا آیا تھا۔ ابوجان کو موٹر سائیکل چلانا کچھ کچھ میں نے سکھایا۔ اور کچھ یہ کام ڈاکٹر خالد پرویز صاحب نے کرایا۔

ابوجان نے مجھے شادی کے بعد کئی باتیں سمجھائیں۔ مثلاً میری بیگم کھانا پکانا بالکل نہ جانتی تھی۔ میرا پارہ چڑھا تو ایک بار سمجھایا کہ بیوی باورچن نہیں ہوتی۔ سالن میں نمک مرچ کے تمھارے مزاج کے مطابق ہونے کے لیے کوئی وحی نہیں اتری جس کی پابندی تمھاری بیگم کے لیے لازم ہو۔ اِن باتوں پر گلچپ نہیں کرتے۔ اگر کھانا مزاج کے مطابق نہیں ہے تو نہ کھاؤ لیکن اِس پر بیوی کی سرزنش کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فرماتے تھے کہ ساس سسر کی خدمت بہو پر فرض نہیں ہے۔ میرے پاس ہری پور تشریف لائے تو مجھے سمجھایا کہ میرا اکرام تمھارے لیے ضروری ہے، تمھاری بیگم پر نہیں۔ ایک بار میں نے پردے کے معاملے میں بے تکی سختی کی تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پردے کی آیتیں مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ اتاری ہیں۔ کوئی عورت اگر پردہ نہیں کرتی تو وہ براہِ راست اللہ کی گناہگار ہے۔ بے پرد ہونا اور (لغوی معنی میں) قاصرات الطرف میں سے نہ ہونا دو الگ مضمون ہیں۔ مردوں کو چاہیے کہ عورتوں کے لیے پردے میں رہنے کا ماحول اور سلسلہ بنائیں لیکن دھیان رہے کہ اللہ نے مردوں کو حکم نہیں دیا کہ عورتوں کو پردہ کرائیں، چنانچہ اِس کے لیے بے جا سختی اور تشدد کسی حال میں نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ سے مانگو، اور پردے کا ماحول بناؤ نہ کہ خالی خولی لیکچر پلاؤ۔ میں نے شادی کے بعد سیر وغیرہ کا پروگرام بنایا تو فرمایا کہ ضرور جاؤ تاہم بہتر ہے کہ یہ پھرنا پھرانا ایک دو بچے ہونے کے بعد کیا جائے۔ مجھ سمیت میرے کئی دوستوں کو بتایا کہ جب امید ہو جائے تو دعا مانگا کرو کہ اللہ تندرست، صحت مند، ذہین، متین، سعید اور سعادت مند اولاد دے۔ بچوں میں مساویت رکھنے کی بہت تلقین کرتے، بلکہ یہ تلقین تو نماز روزے سے بھی زیادہ کرتے۔

ابوجان تعلق کو حتی الامکان نباہتے تھے۔ اُن کی طبیعت جوڑ والی تھی۔ فساد آور باتوں کو وہ بکوشش لگی لپٹی رکھتے۔ میری شادی کے بعد خانگی حالات اچھے نہ رہے یہاں تک کہ سبھی وابستہ عناصر نے سلسلہ لپیٹ دینے کا ذہن بنا لیا۔ اُس وقت میں ابوجان نے مجھے الگ کر کے میری شادی کو چلایا۔

میں آج بحیثیتِ باپ اُن کی دور اندیشی کا قائل ہوں۔ ہجرت میں عافیت ہی عافیت ہے۔ اسلام ''مشترک خاندان'' کے تصور کو اُتنا سپورٹ نہیں کرتا جتنا علیحدہ فیملی یونٹ کو۔ نہ صرف تجربہ بلکہ دینی مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے۔ اکٹھے رہنے میں اگر اللہ کے حکم ٹوٹتے ہوں تو الگ ہوجانا/کر دینا چاہیے۔ فرماتے تھے کہ اچھوں کے ساتھ تو ہر کوئی رہ لیتا ہے، بات تو تب ہے کہ اُن کے ساتھ احسان سے گزاری جائے جو اچھے نہیں ہیں۔ فرماتے تھے کہ ساس بہو کے احکامات خدا نے پڑھے نہ موسیٰ نے لکھے، یہ سب غیر مطلق احکامات ہیں جو ہمارے سماج کے طے کردہ ہیں۔ جو بہو میکے والی عادتیں میکے میں چھوڑ کر آئے، صبح وقت پر اُٹھے، سسرال کو ترجیح دے، لڑائی کر کے میکے نہ جائے، اور خاموشی اختیار کرے، وہ کامیاب بہو ہے۔ لڑکی کو صرف یہ سمجھانا چاہیے کہ پورے سسرال کی عادتیں بدلنے کی بجائے صرف خود کو بدل لینا سہل ہے۔

ابوجان کسی میں کوئی لائقی دیکھتے تو اُسے خوب بڑھاوا اور شوبھا دیتے۔ ملتان کے ہمارے دوست ڈاکٹر عبدالرب نیاز کو ہومیوپیتھی کی سائنس کا رمز آشنا پایا تو اپنے ملتان سے آنے والے مریضوں کو اُنہی کے پاس جانے کا مشورہ دیتے۔ اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں کو دین کی بہتری اور امت کے نفع کے لیے استعمال کرنے کا کہتے کہاتے اور اِس کی ترتیبیں بناتے۔ ذاتی زندگی میں خود آگے آنے کی بجائے اہل لوگوں کو متوجہ کرتے۔ مثال لیجیے کہ تازندگی مرکزی جامع مسجد سیٹلائٹ ٹاؤن اور مدرسہ عربیہ دارالتربیت والتعلیم کے نظام کو معتمد کی حیثیت سے چلاتے رہے اور اِس پورے سیٹ اپ کو چھنے کی بڑی سے بڑی ترغیب اُن کو للچوا نہ سکی۔

اہلِ اقتدار سے تبلیغی ملاقاتیں تو ابوجان بڑھ چڑھ کر کرتے لیکن ذاتی حیثیت میں اِن لوگوں سے ملنے میں احتیاط کرتے۔ ایک صاحب ڈپٹی کمشنر یا کمشنر لگ کر بہاول پور آئے تو تیسرے چوتھے شام میں ہمارے گھر آگئے۔ کچھ دیر بیٹھے۔ ایک آدھ ہفتے میں پھر آئے۔ اُن کا آنا جانا زیادہ ہوا تو ایک دن ابوجان نے اُنھیں کہا کہ آپ کے یہاں آنے سے مجھے مشکل ہوتی ہے کیونکہ لوگ آپ کی گاڑی کھڑی دیکھ کر مجھے آپ کا مصاحب جاننے لگے ہیں۔ آپ تشریف نہ لایا کریں اور کوئی کام ہو تو مجھے یاد فرما لیا کریں۔ الحاصل ابوجان معروف معنوں میں پی آر نہیں رکھتے تھے، لیکن اِس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مردم بیزار تھے۔ پاکستان ہاکی کے سدا فروزاں ستارے ہدایت اللہ، مطیع اللہ، ہوائی گھوڑا (فلائنگ ہارس) سمیع

اللہ اور کلیم اللہ ابوجان کے شاگرد تھے۔ ہدایت اللہ صاحب جو بہاول پور میں پی آئی اے کے سب سے بڑے افسر ہیں، اکثر شام کو آتے۔ وغیرہ۔ بقول ڈاکٹر شفیق احمد، میرے ابوجان نے چھوٹے شہر میں رہنے کی بھاری قیمت ادا کی، یعنی کنایۃً وہ گلِ صحرائی تھے۔ بات درست ہے۔ لیکن یہ بھی تو درست ہے کہ وہ اِس بے مہری پر دل کی گہرائی سے راضی تھے، اور یہ کہ یہ سب کچھ عین اختیاری تھا!

ابوجان دین کے معاملے میں نہایت واضح اور ٹھیٹھ مشرب پر تھے، لیکن کھلی آنکھوں کے ساتھ۔ گہرا دینی علم اور دینی مزاج رکھنے کے باوجود میں نے اُنھیں فتوے کی زبان میں بات کرتے نہیں دیکھا۔ اُنھوں نے کسی کو کافر نہیں بنایا۔ تصادم سے بچتے اور علی الخصوص فروعی باتوں میں نہ الجھتے۔ دوسروں کا پردہ چاک نہ کرتے اور اُن کا بھرم رکھتے۔ تبصرہ کسی پر نہ کرتے کیونکہ تبصرہ ہی غیبت کی تمہید ہوتا ہے۔ میں نے اُنھیں اظہارِ حقیقت کی آڑ میں کسی کی غیبت کرتے نہیں دیکھا۔ ازالۂ منکر اور اظہارِ منکر کے فرق کو وہ مولانا محمد انعام الحسن صاحب کے الفاظ میں بیان کرتے اور فرماتے کہ امت کی کمیوں کو اچھالتے پھرنا امت کی غیبت ہے۔ فرماتے تھے کہ نہی عن المنکر میں انسان کی بے اِکرامی نہیں کرنی چاہیے ورنہ نیکی برباد گناہ لازم آتا ہے۔ کسی سے کوئی زیادتی ہوجاتی تو درگزارنے میں دیر نہ کرتے۔ ہر ایک کے لیے دل صاف رکھتے، اور میں جانتا ہوں کہ یہ کس قدر مشکل کام ہے۔ فرماتے کہ کوئی کیسا ہی بری طرح پیش آئے، تمھاری اچھائی یہ ہے تم ہمیشہ اچھا سلوک کرو۔ چھوٹی نیکی اور چھوٹے گناہ کو چھوٹا نہ جانتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی سنتوں پر عمل کا بڑا اہتمام رکھتے۔ جہاں موقع بنتا چاند کی تاریخ ضرور ڈالتے۔ (اِس میں سہولت اِس لیے بھی ہوگئی تھی کہ اُن کے دستخط اردو میں تھے، اور اُس وقت سے تھے جب ابھی اردو میں دستخط بنانے کی تحریک شروع نہ ہوئی تھی۔) روزانہ امت کے لیے دیر تک دعا مانگتے اور اپنے داغِ مفارقت دے جانے احباب کے لیے ایصالِ ثواب کرتے۔ ہر کچھ عرصے بعد دادا جان کی قبر پر جاتے۔ میں نے دیکھا کہ وہ التزاماً قبر پر ہاتھ اٹھائے بغیر دعا مانگتے ہیں جب کہ تایا جان ساجد ہاتھ اٹھا کر، چنانچہ مجھے سبق ملا کہ یہ دونوں طریقے درست ہیں۔

ابوجان جماعتِ ثانی کے سخت خلاف تھے اور آخر وقت تک رہے۔ سفر میں کئی ایک بار میرے ساتھ اِس بارے میں بات ہوئی۔ اُنھوں نے میرے اصرار پر جماعتِ ثانی میں شرکت کی لیکن دل سے اِس پر راضی نہ ہوئے۔ میں اِس معاملے میں فقۂ حنفیہ کے ''ہندوستانی ورژن'' پر عمل نہیں کرتا

کیونکہ ایک بھی حدیث میں جماعتِ ثانی سے ''روکا'' نہیں گیا۔ میں نے سعودیہ کے علاوہ شام، فلسطین، ترکی، مراکش، مصر، اور روس کی آزاد ریاستوں کے احناف کو ضرورت کے وقت جماعتِ ثانی کا اہتمام کرتے دیکھا ہے۔ نیز یہ بھی دھیان میں رہے کہ اِن ممالک کے صرف عامی لوگ نہیں بلکہ علماء بھی اِن نمازوں میں ساتھ تھے۔ بالکل اِسی طرح غائبانہ جنازہ کے احناف کے ہاں ''ناجائز'' ہونے کی بے وقت کی بھیرویں بجائی جاتی ہے۔ میں نے بیسیوں ہزار حنفیوں کو خانۂ کعبہ میں جنرل محمد ضیاء الحق اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی غائبانہ نمازِ جنازہ میں شریک دیکھا ہے۔ میں نے یونیورسٹی میں ایک کلاس فیلو کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی جو دریا میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ میرے پاس اِس کے لیے دلائل تھے۔ یونیورسٹی میں اِس سے پہلے نمازِ جمعہ میں بھی اِتنا مجمع نہیں دیکھا گیا تھا۔ فضا انتہائی سوگوار تھی۔ لڑکے تو لڑکے، سیکڑوں لڑکیاں بھی پیچھے صفیں بنا کر نماز میں شامل تھیں اور نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑی رہیں۔ ابوجان نے یہ جنازہ پڑھانے پر مجھے کچھ نہیں کہا۔ اگر یہ عمل قابلِ گرفت ہوتا تو مجھے تنبیہہ ضرور کی جاتی۔ ایک بار میں نے اعتکاف میں سب معتکفین کو صلوٰۃِ تسبیح کی جماعت کرا دی تھی، اِس پر مجھے فوراً ٹوکا تھا۔

علماء سے پوچھ کر کام کرنا ابوجان کا روزمرہ تھا۔ ملازمت کی ابتدا میں کسی کے کہے میں آ کر اُنھوں نے درخواست دے کر جی پی فنڈ پر لگنے والی بڑھوتری ختم کرائی۔ پھر کسی کے توجہ دلانے پر مفتیِ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خط کتابت کی جس کے نتیجے میں یہ تحریری فتویٰ ملا کہ جی پی فنڈ پر دی جانے والی بڑھوتری سود نہیں ہے۔ چنانچہ درخواست دے کر (۴/ مارچ ۱۹۷۵ء) یہ اضافہ بحال کرایا اور جتنا عرصہ یہ بڑھوتری رکی رہی اُس کی بحالی کے لیے بھی خط کتابت ہوتی رہی۔ میں نے اُن کی پرسنل فائل میں یہ پوری کارروائی دیکھی ہے۔

میرے ابوجان دین پر عمل کے بہانے ڈھونڈتے تھے اور مسلمانوں کی جو ضرورت دیکھتے اُس کے لیے عملی کام کرنے کی کوشش کرتے۔ مثال لیجیے کہ جب حج کے لیے گئے (۱۹۸۸ء) تو وہاں دیکھا کہ اُس لکھاوٹ میں قرآنِ پاک موجود نہیں ہیں جس سے برِعظیم کے مسلمان عام طور سے مانوس ہیں۔ واپس ہوئے تو فوراً تاج کمپنی کے پندرہ سطری قرآنِ پاک کو، جس پر مجھے حفظ کرایا تھا، کافی تگ و دو سے شاہ فہد قرآن کمپلیکس مدینہ منورہ بھجوایا۔ اِس کے ساتھ انگریزی میں ٹائپ شدہ ایک لمبا خط مجھے

اب بھی یاد ہے۔ اِس سلسلے میں شاید ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک سے بھی رابطہ رہا جو اُن دنوں سعودیہ میں تھے۔ المختصر شاہ فہد قرآن کمپلیکس والوں نے یہ تجویز قبول کی اور قرآنِ پاک کے اِس نسخے کا عکس وہاں سے شائع ہونا شروع ہوگیا۔ یہ ابو جان کے توشۂ آخرت کی ایک ممتاز چیز ہے۔ میں نے یہ قرآنِ پاک آپ لوڈ بھی کر دیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: quranflash.com

میری قرآنِ پاک کی منزل کے بارے میں ابو جان مجھ سے زیادہ متفکر رہتے۔ بچپن میں میری منزل خود سنتے۔ آندھی ہو، طوفان ہو، یا کوئی مہمان ہو، گھر میں ہوں یا کہیں عید وغیرہ کے لیے گئے ہوئے ہوں، روزانہ کے دو سیپارے کبھی ناغہ نہ ہونے دیے۔ میری منزل کی ترتیب ایسی بنا دی کہ دیکھ کر پڑھنے کا وقت نہ بھی ملے تو منزل قابو میں رہے، اور وہ یوں کہ گھر سے نکلتے ہی یا گاڑی میں بیٹھتے ہی تلاوت شروع۔ تراویح میں میرا قرآن سنتے۔ شوق دلانے کے لیے حکایاتُ المَشائخِ جُنْدٌ مِنْ جُنُودِ اللّٰہ کے مصداق حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ اور بعد کے بزرگوں کے لمبی لمبی رکعتیں پڑھنے کے واقعات سناتے۔ ایک بار میں نے کہا کہ دو رکعتوں میں پورا قرآن سناؤں گا۔ بالکل نہ مانے اور اِسے خلافِ سنت و ادب فرماتے رہے۔ میں نے اصرار کیا۔ سردیاں تھیں۔ ایک رضائی نما کمبل لپیٹ کر کھڑے ہوگئے۔ لیکن مجھے خود ہمت نہ ہوئی۔ اکیس سیپارے پڑھ کر دوگانہ پورا کیا۔ اِس بات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ ابو جان ایک رات میں شبینہ پڑھنے پر سخت (اور جائز) تحفظات رکھتے تھے اور کبھی ایسی بدعت میں شریک نہ ہوئے۔ میرے ساتھ یہ عنایت اِس لیے ہوئی کہ میں یونیورسٹی سے عید کے لیے گھر آیا تھا اور میرے پاس رمضان کی صرف ایک رات تھی۔

ابو جان قرآنِ پاک کی تلاوت سے لذت لیتے اور بھن بھن کرتی آواز میں نہایت سوز اور خوش لحجگی سے پڑھتے۔ رمضان میں ہر تین دن میں ایک قرآن اور معمولاً چاند کی تاریخ کے حساب سے روزانہ ایک سیپارہ پڑھتے۔ اِس طرح اُنھیں چاند کی تاریخ کبھی نہ بھولتی تھی۔ مجھے قرآنِ پاک نہایت اعلیٰ تجوید کے ساتھ حفظ کرایا، لیکن مقابلۂ حسنِ قرات کے لیے پڑھنے والی مہارت پیدا نہ کی۔ کوئی قاری صاحب خوامخواہ غنائیت پیدا کرتے یا گلے سے گراریاں نکالتے تو شدید کڑھتے۔ فرماتے تھے کہ لوگوں میں واہ وا کرانے کے لیے قرآن کو گانے کی بجائے سیدھے سیدھے گانا گا لینا چاہیے کہ لوگوں کو سمجھ تو آئے کہ گایا کیا ہے (یعنی گناہ بالذت ہونا چاہیے)۔ وہ مقبول گانوں کی دھنوں پر نعتیں گانے کے بھی

سخت خلاف تھے۔ بلکہ نعت کے لیے تو وہ ذرا سا ترنم بھی برداشت نہ کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ شیطان کا نورانی داؤ ہے اور یہ راستہ جس طرف لے جاتا ہے وہ میرا دیکھا بھالا ہے۔

اللہ نے اُنھیں حسنِ نیت کا ایسا پھل دیا ہے کہ بیان سے باہر ہے اور قابلِ صد رشک۔ اللہ جانے وہ کون سا سعید لمحہ تھا جب اُن کے لیے طواف کرنے کی دعا قبول ہوئی۔ شاید ہی کوئی مہینہ جاتا ہوگا کہ کوئی اللہ کا بندہ یا بندی اُن کے لیے طواف نہ کرتا/کرتی ہو۔ مکۂ مکرمہ زادہا اللہ تشریفا کے باسی ایک بندۂ خدا نے بتایا کہ میں ہر ہفتے عابد صدیق صاحب کے لیے ایک طواف کرتا ہوں۔ جن لوگوں نے اُن کے لیے طواف کیا اُن میں کے چند نام جو ابھی یاد آرہے ہیں: پروفیسر عطاء اللہ اعوان، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، پروفیسر عبدالجبار شاکر، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک، پروفیسر انور مسعود، حکیم محمد خالد، ڈاکٹر محمد عمر فاروق، بیگم و ڈاکٹر ظہیر احمد، منور آفریدی، قاسم منصور جلالی، حافظ عاصم حسن، سیدہ فرحت فاطمہ رضوی، جاوید اقبال قزلباش، روحیل خاں کنڈی، سلمان سعد خاں، چودھری غلام یزدانی، خواجہ غلام ربانی مجال، شایان الحق حقی، راؤ صفدر رشید، بیگم و سید افتخار حسین شاہ، وغیرہ۔ اور بے شمار شاگرد اور وہ لوگ جو اُن سے دوا لے جاتے تھے جن کے نام صرف اللہ جانتا ہے۔

اُن کی خوش تراش شخصیت کے کئی پہلو ایسے ہیں جنھیں میں اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے جذب نہیں کر پایا۔ شان الحق حقی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، رشید حسن خاں، ڈاکٹر مظہر محمود قریشی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، اسد محمد خاں، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، پیر سید نصیرالدین گیلانی، ڈاکٹر محمود احمد غازی، خواجہ غلام ربانی مجال، اخلاق حیدر آبادی، جنابِ عبدالستار نعیم، برادرم ڈاکٹر محمد اطہر مسعود، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ستیہ پال آنند وغیرہ سمیت بڑے لوگ اِس پر متاسف رہے ہیں کہ اُن کی میرے ابوجان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مرحوم مجال صاحب تو وہ آدمی ہیں جن کی برکت سے میں نے اپنے ابوجان کی اردو کے لیے غیرتِ لسانی کو سمجھا ورنہ قریب تھا کہ اردو کے اِملاء کا مشلہ کرنے والوں کا آلۂ کار بن جاتا۔ اُنھوں نے میرے ابوجان کے تنقیدی نظریات کو الم نشرح کر کے مستقل تحقیقی مقالے کی صورت دی جسے ڈاکٹر رشید امجد نے معیار-۵ میں چھاپا۔ اللہ چاہے تو لکھا کبھی نہیں مٹتا۔ اردو کے پاس نقادوں کی شدید کمی ہے جس کا علاج ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ بتایا تھا کہ اپنے نقاد خود پیدا کرو۔ میں مجال صاحب کے لیے دست بدعا ہوں جنھوں نے آخرِ عمر میں یہ منزل سر کی اور اردو والوں کو ایک

گراں قدر سرمایہ دے گئے۔ اردو تحقیق وتنقید آثار الصنادید سے نکل کر نئے بساؤ کی تیاری کر رہی ہے۔ اللہ نے چاہا تو مجال صاحب کا یہ مقالہ ایک مینارۂ نور کا کام دیتا رہے گا۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز۔

ابوجان کے بارے میں ایک نایاب بات جسے سب سے پہلے جنابِ مشفق خواجہ نے بڑی للک سے ذکر کیا، یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر اُن کے لیے محبت عام بکھری ہوئی ہے۔ اُن کے جملے دیکھئے:

''عابدصدیق صاحب کی شخصیت میں میں نے عجیب بات دیکھی۔ اُن کی وفات کے بعد جس نے بھی اُن کا تذکرہ کیا، انتہائی محبت کے ساتھ کیا اور بہت ہی محبت کے ساتھ اُن کو یاد کیا۔ اکثر اہلِ قلم تو کسی کا ذکر زندگی میں بھی اچھے الفاظ میں نہیں کرتے۔ میں نے یہ محبت صرف عابدصاحب کے لیے دیکھی کہ ہر شخص اُن سے محبت کرتا ہے، جو دھڑے بندیوں کے اِس دور میں بڑی ہی عجیب بات ہے۔'' [۱]

سب جانتے ہیں کہ ابوجان کی زندگی میں میرا اردو اور اردو ادب سے کیا واسطہ تھا۔ ناموزونیِ طبع سے تو الحمدللہ آج بھی مالا مال ہوں۔ میں تو اردو میں ۲۰۰ میں سے ۶۷ نمبر لے کر یعنی صرف ایک نمبر سے پاس ہوا تھا اُن کی زندگی میں۔ لیکن اُن کی وفات کے بعد گردشِ ایام نے جب مجھے ادب کے حلقے سے مس کرایا تو میں نے کراچی اور کوئٹہ سے لے کر پشاور، ایبٹ آباد اور مانسہرہ تک، اور وطنِ عزیز سے باہر علی گڑھ اور دہلی تک بلکہ برمنگھم، ڈیوزبری، ووکنگ اور لندن تک اور حرمین کی پاک فضاؤں میں، جس سے اُن کا تذکرہ سنا، اُسے اُن کا گرویدہ پایا۔ میں سال ایک فیصل آباد رہ کر آیا ہوں تو وہاں گلی گلی اُن کی یاد بچھی پائی ہے: اقبال فیروز صاحب، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، ڈاکٹر انور محمود خالد، ڈاکٹر ریاض مجید، پروفیسر خالد شبیر احمد، ڈاکٹر محمد آصف اعوان، ڈاکٹر غلام اکبر، ڈاکٹر طاہر تونسوی، اور بہت سے لوگ..... میں جس سے ملا، یادخزانے کھولتے اور ابوجان کی نسبت سے مجھے محبتوں سے شرابور کرتے پایا۔ اور اب ملتان آیا ہوں تو حضرت مولانا محمد حبیب الرحمٰن ہاشمی، پروفیسر لطیف الزمان خاں، ڈاکٹر مختار احمد ظفر، ڈاکٹر محمد امین، پروفیسر سید عقیل جابر، پروفیسر حسین سحر، پروفیسر انور جمال، پروفیسر انعام الٰہی فاروقی، پروفیسر شوکت مغل، جناب شاہد زبیر، ڈاکٹر سید علمدار حسین بخاری، جنابِ نعیم چودھری، پروفیسر مبارک مجوکہ، پروفیسر سید اصغر علی شاہ، خالد مسعود خاں، جنابِ مستحسن خیال خلجی، حبیب الرحمٰن بٹالوی، چودھری شفیق ایڈووکیٹ، پروفیسر شمیم عارف قریشی، پروفیسر منیر رزمی، فیاض تحسین، ڈاکٹر اسلم انصاری، حماد

رسول، ڈاکٹر محمد آصف، ڈاکٹر قاضی عابد، ڈاکٹر روبینہ ترین، وغیرہ وغیرہ۔ میں تو ابھی سب سے مل بھی نہیں پایا اور رسمی ''خوش آمدیدی ملاقات'' تک نہیں ڈال سکا۔ (یہ ترکیب ''الوداعی ملاقات'' کے متضاد کے طور پر گھڑی ہے: ''پہلی ملاقات'' کی ترکیب کچھ اور قسم کے معنی دیتی ہے۔) ابھی اِن لوگوں سے ملنا ہے، اور ظاہر ہے کہ سب کے پاس محبتیں ہی محبتیں ہیں میرے لیے۔ ملتان میں میں اب سے پہلے ڈاکٹر تاثیر وجدان سے بھی ملا۔

ابوجان کے لیے بکھری محبت کی خوشبو لینے کے لیے میں نے باقاعدہ نیت باندھ کر سفر کیے ہیں۔ کراچی میں ابراہیم عبدالجبار صاحب، مولانا اسحاق صدیقی سندیلوی، مولانا عبدالشہید نعمانی، جنابِ ابوسعادت جلیلی، ڈاکٹر حافظ ساجداللہ تفہیمی اور مشفق خواجہ؛ حیدرآباد میں ڈاکٹر الیاس عشقی؛ کوئٹہ میں محمد طاہر مرزا اور رئیس صاحب؛ پشاور میں ڈاکٹر نذیر تبسم، ڈاکٹر محمد احسان الحق، پروفیسر محسن احسان اور پروفیسر خاطر غزنوی؛ ایبٹ آباد و مانسہرہ میں پروفیسر بشیر محمود اختر، ڈاکٹر صابر کلوروی اور ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان؛ اٹک میں پروفیسر عبدالکریم (جنھوں نے تبلیغ کے نصاب کی بیشتر کتابوں کا انگریزی ترجمہ کیا ہے)؛ ساہیوال میں پروفیسر ریاض حسین زیدی، پروفیسر سید محمد اکبر شاہ، پروفیسر قاضی حبیب الرحمٰن، پروفیسر ارجمند احمد قریشی اور پروفیسر عطاء الرحمٰن قاضی وغیرہ؛ سرگودھا میں ہمارے خاندان کے عظیم محسن ڈاکٹر محمد اکرم چودھری؛ رحیم یار خاں میں پروفیسر عبدالعزیز جاوید، ڈاکٹر مختار احمد عزی، پروفیسر حشمت اور پروفیسر ملک احمد بخش؛ ہارون آباد میں ڈاکٹر عبدالخالق تنویر؛ اوکاڑہ میں پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی؛ مظفر آباد آزاد کشمیر میں راجہ محمد الطاف کیانی (جو اُن کے ایم اے کے کلاس فیلو تھے اور حکومتِ آزاد کشمیر کے سیکریٹری امر بالمعروف و نہی عن المنکر)؛ راول پنڈی اسلام آباد میں پروفیسر فتح محمد ملک، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، پروفیسر انور مسعود، عبدالجبار شاکر، ڈاکٹر رشید امجد، منشا یاد، ڈاکٹر طیب منیر، ممتاز اقبال ملک، میجر غلام نبی اعوان، ڈاکٹر انوار احمد اور ڈاکٹر نجیب جمال؛ لاہور میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر خورشید رضوی، پروفیسر آغا محمد جلیل الرحمٰن، ڈاکٹر وحید قریشی، عبدالعزیز خالد، سید قاسم محمود، مسعود اشعر، مجیب الرحمٰن شامی، ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر صدیق جاوید، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، شہزاد احمد، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر اکرم اکرام، ڈاکٹر خالد پرویز، ڈاکٹر حافظ محمد اشرف، پروفیسر جعفر بلوچ، ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر آفتاب اصغر، حزیں

کاشمیری؛ علی گڑھ میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ، وغیرہ وغیرہ یہ وہ لوگ ہیں جن سے میں ابوجان کی باتیں سنتا ہوں یا سنتا رہا ہوں۔ اردو بازار لاہور میں ایک دکان پر پہلی مرتبہ گیا تو دکاندار کو ایک گاہک سے مصروفِ کلام پایا۔ ناچار شیلفوں کو تکا کیا۔ اُس گاہک نے جس کے لیے چائے آگئی تھی، دکاندار سے میرے ابوجان کی ایک کتاب طلب کی اور بتانے لگا کہ میں اُن کا شاگرد ہوں۔ اُنھوں نے مجھے یہ اور یہ پڑھایا، اور پھر میں یونیورسٹی میں داخل ہوا اور نئی کلاس میں ایک سوال کا صحیح جواب صرف میں ہی دے پایا تو پروفیسر صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ بی اے میں یقیناً عابد صاحب کے شاگرد رہے ہوں گے۔ بازار کا شور میرے کانوں آنا بند ہوگیا تھا اور میں صرف اِس گفتگو کو سن رہا تھا۔ میں آگے بڑھا۔ گاہک صاحب کو سلام کیا اور اپنا نام بتایا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا اور اپنا نام ذیشان تبسم بتایا۔

ابوجان کے کتنے ہی دوستوں کے نام اِس وقت ذہن کے پردے پر ابھر رہے ہیں جنھیں اردو کے لوگ ذرا کم جانتے ہیں: عبدالجواد صدیقی، پروفیسر سید سعید احمد، پروفیسر ظفر احمد چودھری، مولانا محمد معاذ، جمیل چودھری، پروفیسر طیب قریشی، ڈاکٹر سعید صدیقی (جنھیں ہم انکل ڈربی کہتے تھے)، پروفیسر عظیمی ایف ایم شیخ، وغیرہ۔ یہ سب اُن کے جُٹ قسم کے دوست تھے۔ وہ اپنے تعلق والے احباب سے میل ملاقات رکھتے۔ ملتان آتے تو حکیم محمد حنیف اللہ صاحب کے دواخانے کے گودام میں اپنے قدیمی دوستوں کے ساتھ بیٹھتے جہاں میں اور حکیم خالد وغیرہ وغیرہ پیچھے بیٹھے رہتے۔ وفات سے کچھ پہلے سارے ملک میں رشتے داروں کے یہاں چکر لگا کر آئے۔

ابوجان کی کئی باتیں ایسی ہیں جنھیں کبھی سوچتا ہوں تو قرونِ اولیٰ کے لوگوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ باوجود تنگدستی کے، خاندان اور خاندان باہر کے کتنے ہی بچوں بچیوں کو گھر پر رکھ کر کے یونیورسٹیوں تک پڑھایا۔ میرے میٹرک کے کچھ کلاس فیلوز کو داخلہ دلایا اور اُن کی فیسیں دیتے رہے۔ کچھ غریب لڑکوں کے درماہے بھی مقرر کر رکھے تھے۔ (مجھے یہ باتیں اُن کی وفات کے بعد اِن لڑکوں سے معلوم ہوئیں۔)

ہومیوپیتھی میں ابوجان کے درک کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اُن کی قرابادین میں بیسیوں تیر بہدف نسخے تھے جو صرف تیر تکّے نہیں بلکہ اُن کے گہرے سائنسی شعور، گمبھیری اور مجتہدانہ بصیرت کے زائیدہ تھے۔ کئی امراض کا علاج وہ محض مشتہیات یا مسہلات سے کرتے۔ غذا اور کھانے کے وقفوں کو کم

زیادہ کر کے دوائی خصوصیات حاصل کرنے کے بارے میں گُر کی کئی باتیں مجھے بتائیں۔ ایک بار کسی کو میٹھا چھوڑنے کے بارے میں بتا رہے تھے کہ میٹھے کی خواہش اِس لیے ہوتی ہے کہ کسی عامل کی وجہ سے جگر سے ایک رطوبت نکلنے لگتی ہے۔ اِس رطوبت کو خشک یا غیر فعال کر دیا جائے تو میٹھے کی اشتہاء نہیں ہوتی۔ پھر یہ دوا بتائی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹی بی کی بگڑی ہوئی شکل بنی جو ایک طرح سے سرطان کا مقدمہ تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار ابوجان کسی کو بتا رہے تھے کہ ہڈیاں پھول جاتی ہیں اور ڈاکٹر اِس مرض کو ٹی بی سمجھتے ہیں۔ ہومیوپیتھی میں ہڈیوں کو سکیڑنے (Squeeze) کی دوا موجود ہے۔ میں نے ہڈیوں کے سنت علاج کے ساتھ یہ دوا بھی استعمال کی۔ میرے اللہ نے کرم کر دیا۔

☆.....۶.....☆

میرے ابوجان کی شاعری میں دین وتصوف اور ثقافتِ اسلامی کی خاص لہر اور نظائر ہیں۔ مثلاً اُن کی نعتوں میں جنابِ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا مبارک کا تذکرہ اور ہجر وفراق جیسے مضامین بطورِ وظیفۂ شاعری نہیں پائے جاتے نہ ٹیگور والی متصوفانہ رومانیت کی کوئی جھلک، اور نہ لباسِ مجاز کی رنگا رنگی سے مملو رومانی شاعری والی لفظیات، بلکہ وہ مقصدِ نبوت اور اِس کی اشاعت وتبلیغ کو باوقار شعری پیرہن عطا کرتے ہیں۔ اُن کی نعت کی نَے سے وہ نغمہ نکلا جو دُرت کی لَے میں احمد کی میم کو گرا کر احد نہیں بناتا۔ اُن کے اپنے الفاظ میں شاعر کا منصب اللہ اور بندے کے درمیان رابطہ کاری ہے۔ لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُن کی شاعری، پروفیسر کلیم الدین احمد کے الفاظ میں، نری ''پیغمبرانہ شاعری'' ہے جو شعریت اور تغزل سے یا زبانِ اردو کے مخصوص لوچ اور لچک سے تہی ہے بلکہ یہ اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کے ساتھ ساتھ زندہ سماج، زمین اور اندلمانی (Indo-Muslim) ثقافت سے جڑی ہوئی ہے۔ لیکن یہ ایک جداگانہ الٰہیات ہے جس پر گفتگو کا نہ یہ محل ہے اور نہ یہ میرا مقام۔ اُن کی موجود شاعری میں کوئی ایک بھی شعر ایسا نہیں جس کی وجہ سے اُن کی اولاد کو منہ چھپانا پڑے اور نہ ہی کوئی پُرکن مصرع اُن کے ہاں ملتا ہے۔ روحِ عصر سے بھرپور شاعری کرنے کے باوجود آبروئے ما نِامِ مصطفیٰؐ است اُن کا جادہ رہا، اور یہ اِس لیے بھی کہ بڑے اور اہم مغربی شعراء اور اہلِ قلم کا پانی خود ناپ چکے تھے لہٰذا اردو شاعری کی کائنات اور نظریۂ کائنات کے بارے میں کسی احساسِ کمتری کا شکار نہ تھے۔ (انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ رکھتے ہوئے اردو ادب کے بارے میں ایسا دبنگ

رویہ اُن کے علاوہ میں نے صرف ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر خورشید رضوی اور ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی میں پایا ہے۔) اُن کا حسنِ خاتمہ اور اللہ والوں کی صحبت سے جو بہرۂ وافی اُنھیں ملا تھا وہ میرے اِس دعوے کی دلیل ہے۔

تہذیب کے فریب کا انسان تھا شکار
ریگِ عرب نے کھولی حقیقت سراب کی

اُن کا اسلوب عام طور سے سبک اور عالمانہ کے بین بین ہے لیکن Pedantry سے کوسہا کوس دور۔ عربی و فارسی کا عام علمی استعداد سے خاصا آگے کا علم رکھنے کے باوجود اُن کی معرضِ شاعری میں لائی گئی تراکیب بوجھل نہیں ہیں اور نہ زمین زادگی کا زعم اُنھیں ہندی و پاکستانی زبانوں کے دڑے لگانے پر اکسا سکا ہے۔ چنانچہ اُن کی کوئی تحریر اظہارِ علمیت اور لسانی ورزشوں کا اکھاڑہ نہیں بنی۔ اُن کے ہاں نہ تو کششِ انبوبِ شعری اور آلۂ مسماع الصدر قسم کی عربیت نظر آتی ہے اور نہ مہا بکّو چھٹیرا اور پتر گھسیڑ مارکہ ہندیت۔ میری طالبعلمانہ رائے میں تحریر کو موٹے موٹے لفظوں اور محاوروں روزمروں کی کثرت سے خمیرۂ زورِ زبان بنانا مقصدیت کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لفظوں کا بھار تحریر میں موجود فکریہ کی ہلکاوٹ کو دور نہیں کر سکتا۔

جنابِ شان الحق حقی نے لکھا ہے کہ:

''میری طرح آپ کے والد بھی کسی ادبی لیبل کو ماتھے پر چپکائے ہوئے نہ تھے اور ادب کو تعصّبات سے بالا لے گئے تھے۔ لیکن اُن کے مزاج کا ضبط مجھ سے زیادہ تھا اور قابلِ رشک۔ اِس باب میں تو وہ صحیح معنوں میں صوفی تھے۔ میں تو اپنے مضامین کے مجموعے کے پیش لفظ میں اپنے مزاج کے برعکس ناقدریِ زمانہ کا شکوہ کر بیٹھا تھا لیکن آپ کے عزت مآب والد اپنے مجموعۂ کلام کے پیش لفظ میں اعتراف کیے جانے کی خواہش پر بند لگا گئے ہیں۔ یہ پیش لفظ اُن کے مزاج کا صحیح آئینہ ہے، صد آفریں۔'' [۲]

حقی صاحب اپنے تئیں سندالوقت تھے اور مجھے اُن کی محبتوں اور اعتماد کا امین ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ شہرت کے سایوں میں رہنے اور سرابوں کے پیچھے بھاگنے والوں کا حال وہ بھی جانتے تھے اور میرے ابوجان بھی۔ میری نگاہ کو اللہ خطا بینی سے بچائے، حقیقت یہی ہے کہ میں نے ادب کے ایوانوں

میں اللہ کے دیے پر راضی لوگ صرف چار پانچ ہی پائے ہیں ورنہ دنیا کے باقی شعبوں کی طرح تملق اور چاپلوسی کی اِس لنکا میں بھی سبھی باون گزے ہیں۔ اور اپنے معلوم علم کی بنیاد پر میں گواہی دیتا ہوں کہ میرے ابوجان استغناء کی اُس سطح پر تھے جہاں مدح و ذم برابر ہوجاتے ہیں۔ جن لوگوں سے میرا واہ پڑا ہے اُن میں استغناء کی اِس سطح پر میں نے کچھ ہی بندگانِ خدا اور پائے ہیں، مثلاً ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر سید خورشید رضوی وغیرہ۔

ابوجان کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ میں نے مؤسسِ تبلیغ مولانا محمد الیاسؒ کے ملفوظات کا ترجمہ (Words & Reflections of Molana Ilyas RA) کیا تو اِسے پوری توجہ سے تک سے سکھ کر کے مجھے واپس کیا، ہدایات دیں، اور انگریزی لکھنے کے گُر سکھائے۔ فرمایا کہ انگریزی کو ویسے استعمال کرو جیسے انگریز کرتے ہیں نہ کہ اُنھیں انگریزی سکھاؤ اور اُن کی غلطیاں دور کرو۔ فرمایا کہ اپنا سٹائل خود بنانا چاہیے اور کسی کی نقل نہیں کرنی چاہیے، اور اِس کے لیے ضروری ہے کہ کم سے کم ایک بڑے انگریز مصنف کو پوری توجہ سے اور پورا پڑھ لیا جائے۔ اپنے سٹائل پر احساسِ کمتری نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں نے انگریزی لکھنا ابوجان سے سیکھی، اور محترمہ شائستہ زید سے خبریں سن کر اور جنابِ عمر قریشی کی کرکٹ کمنٹری سن کر تلفظ سیکھا۔ میں اِن سب کا احسان مند ہوں۔ (یہاں یہ ذکر بھی کردوں کہ ملفوظات مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ترجمہ میں نے ابوجان کے توجہ دلانے پر کیا تھا۔ میری الل ٹپ چیزیں چھپتی رہتی تھیں۔ لیڈی ڈیانا کی ''شہادت'' کے سانحے پر The News میں میری ۶۵ لائنوں کی انگریزی نظم چھپی تو فرمایا کہ بیٹے کوئی کام کرو، ایسی واقعاتی مار دھاڑ سے وقت اور صلاحیت دونوں ضائع ہوتے ہیں۔ ریت کے قلعے نہیں بنایا کرتے۔ اللہ ہی کا کرم ہوا کہ میں اِس ترجمے میں لگ گیا۔)

ابوجان کتاب سے متعلق کئی ایسے لوگوں کا ذکر کیا کرتے تھے جو فی الاصل زمین کا نمک تھے۔ سید القوم سر سید احمد خاں، علامہ عبداللہ یوسف علی، مولوی سید نذیر احمد دہلوی، ڈاکٹر محمد حمیداللہ، رینے گیوں اور ڈاکٹر محمد اسد وغیرہ کی باتیں بڑے شوق اور محبت سے سناتے۔ ایک بار میرے ہاتھ میں طوفان سے ساحل تک دیکھی تو کہا کہ نہیں، پہلے اصل کتاب پڑھو۔ اگلے روز مجھے The Road To Mecca لادی۔ وہ The Message of The Quran کی انگریزی کے بڑے شیدائی تھے۔ فرماتے تھے کہ اِس سے بہتر انگریزی میں ترجمہ وتفسیر شاید ممکن نہیں کیونکہ محمد اسد نے عربی کے قدیم

محاورے اور لسانی مزاج پر عبور کے بعد یہ کام کیا ہے۔ اُن کا بات رکھنے اور دلیل لانے کا انداز بہائے لے جاتا ہے اور اُن کی انگریزی انتہائی ٹھیٹ ہوتے ہوئے بھی رواں دواں ہے۔ اُن کے بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم میں الرحیم کا ترجمہ: The dispenser of grace، فبایِّ الآءِ ربکما تکذِبان کا ترجمہ: ?Which, then, of your Sustainer's powers can you disavow، مشرک کے لیے Associationist اور He who ascribes divinity to aught beside God وغیرہ وغیرہ کی مثالیں دیتے۔ فرماتے تھے کہ وحی اگر انگریزی میں اترتی تو شاید ایسی ہی ہوتی۔ اِس سے پہلے وہ علامہ عبداللہ یوسف علی کے ترجمۂ قرآنِ پاک سے حوالے دیتے تھے۔ محمد اسد کا ترجمۂ قرآن اُنھوں نے میرے ترجمۂ ملفوظات کے دوران میں بہت دیکھا تھا جو میں نے اُنھیں پیش کیا تھا۔ فرماتے تھے کہ مولوی نذیر احمد کا اردو کے ارکانِ خمسہ میں شامل ہونا اور ناول نگاری وغیرہ سب بجا، اُن کا امت پر ایک بڑا احسان Indian Panel Law کا ترجمہ ہے جو عائلی قوانین کے لیے آج تک عدالتوں میں کام آنے والی بنیادی کتاب ہے۔ اِس کتاب کے مطالعے کی ضرورت اُنھیں زندگی کے آخری دور میں طلاق وخلع اور زنا شوئی وغیرہ کے کچھ مقدمات کی پیروی کے سلسلے میں پڑی تھی۔ ایک بار نکاح نامے کی تاریخ بتاتے ہوئے فرمایا کہ شاید برطانوی راج کے دور میں نکاح کے لیے باقاعدہ لکھت پڑھت کی یہ عدالتی ضرورت پیدا ہوئی تھی۔ نکاح نامہ کوئی خلافِ سنت چیز نہیں بلکہ یہ صرف ایک مفاہمتی یادداشت (Memorendum of Understanding) ہوتا ہے جس میں کچھ وابستہ عناصر فریقین کے درمیان طے پائی جانے والی شرائط کے گواہ ہوتے ہیں۔ معاہدے کو ضبطِ تحریر میں لانا تو اسلام کی شان ہے، افسوس کہ ایک وقت تک ہندی مسلمان اِس معاہدۂ نکاح کو لکھنے کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ فرماتے تھے کہ مولوی نذیر احمد نے عدالتی ضرورت کے متن کو بھی زباندانی کا تڑیڑا دیا ہے۔ اِس کی کئی مثالیں سناتے تھے۔ اِسی طرح سر سید احمد خاں کی آسان اور استعمالی اردو کے لیے کوششوں کا ذکر کرتے جب کہ اردو صرف ادبی زبان تھی اور قرار واقعی ضرورتوں سے کوئی لینا دینا نہ رکھتی تھی۔ رینے گینوں کی کچھ کتابوں [کے انگریزی ترجمے] کو پڑھ لینے کے بعد کہا کرتے تھے کہ وہ شاہ ولی اللہؒ کے پائے کے عالم تھے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی غیرتِ دینی اور بے نفسی سے ٹھوس علمی کاموں میں لگے رہنے کو بطورِ مثال بیان کرتے۔ وغیرہ۔

ابوجان ادبی رائے دینے میں لگی لپٹی نہ رکھتے تھے اگرچہ احترام کو بھی کامل ملحوظ رکھتے۔ ایک مشہور شاعر کے بارے میں ایک بار ارشاد فرمایا: ''وہ شاعر نہیں غزل گو ہے''۔ ایک بڑے نقاد کے بارے میں ارشاد ہوا: ''وہ نقاد نہیں نثر نگار ہیں''۔ اردو ادب کا کچھ مطالعہ کر لینے کے بعد میں اِن جملوں کو آج بلاغت کی بہترین مثالیں پاتا ہوں۔ اردو تنقید کی روایت کے سر و پا آشنا ہونے اور مغربی تنقید کے براہِ راست مطالعے کی وجہ سے ابوجان کبھی کبھی ایسے جاروبی بیانات (Sweeping Statements، پھڑکانویں جملے) جاری کرنے کا شاید حق بھی رکھتے تھے۔ پطرس بخاری، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، جنابِ مختار مسعود اور یوسفی صاحب قبلہ کے کئی جملے وہ بڑے رچاؤ سے گفتگو میں بیندھ دیا کرتے تھے۔ علماء میں مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ کے اسلوب کے بڑے مداح تھے اور فرماتے تھے کہ وہ نہایت سادہ اور سامنے کے الفاظ میں لکھتے ہیں اور اُن کی تحریر میں کوئی لفظ زائد نہیں ہوتا، لہٰذا اُن کی تحریر کی تلخیص نہیں ہوسکتی۔ مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرماتے تھے کہ وہ واو اضافت لائے بغیر مشکل ہی سے کوئی فقرہ مکمل کرتے ہیں۔ (یہ اِس وجہ سے کہ وہ بنیادی طور پر خطیب تھے، اور خطیب مترادفات کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔) تبلیغ کی فضائل کی کتابوں اور آپ بیتی کے حوالے سے حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے اسلوب کا ذکر کرتے تھے کہ اُن کا اردو کے کلاسیکی شعری ادب کا مطالعہ اِن کتابوں سے چھلکتا ہے، اور کئی ایسے مقامات کو باحوالہ سناتے جہاں حضرت شیخؒ نے کوئی شعر یا کسی شعر کا کوئی ٹکڑا جڑا ہے۔ اِسی طرح حضرت تھانویؒ کے بڑے مداح تھے اور فرماتے تھے کہ وقت کی قدر کرنا تو کوئی اُن سے سیکھے۔ تفسیر بیان القرآن کے بارے میں اُن کی رائے تھی کہ یہ عام لوگوں کے لیے لکھی ہی نہیں گئی کیونکہ اِس کا اسلوب ولفظیات صرف عربی دان علماء کے لیے موزوں ہے۔ فرماتے تھے کہ لوگ بیان القرآن کا دیباچہ پڑھے بغیر اِس پر اعتراض کرتے ہیں۔ ایک مضمون نگار نے اِس کے کچھ مقامات پر اعتراض کیا تو اِس کے سعودیہ اور جرمنی سے چھپے ایک ایک نسخے پر یہ تصحیحات کرلیں۔ یہ تصحیح شدہ نسخے لے کر مولانا محمد احمد انصاری صاحب کے پاس گئے تو اُنھوں نے دو ڈھائی گھنٹے لگا کر ایک ایک نکتے کی وضاحت کی اور فرمایا کہ مضمون نگار کو کئی جگہ پر خود غلطی لگی ہے۔ ابوجان نے یہ درستیاں سفیدہ پھیر کر واپس پلٹائیں۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مفتی محمد شفیع صاحب کی معارف القرآن بھی مکمل پڑھیں۔ حضرت تھانوی کے مواعظ بھی مکمل پڑھے اور حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے خطوط کے کئی دفاتر بھی۔

ابوجان مجھے آخری بار کالج لے کر گئے تو لائبریری میں عربی فارسی سمیت کئی شعبوں کے پروفیسر موجود تھے اور ''جد و جہد'' کا اشتقاق اور تلفظ زیرِ بحث تھا۔ ہمارے پہنچنے پر سب نے سکھ کا سانس لیا اور (ایک انگریزی محاورے کے الفاظ میں) اپنے بندر اُن کے کندھے پر ڈال دیے۔ اِس بحث کو ہاتھ میں لینے پر اُن کے دلائل کی روشنی میں ''جِد وجُہد'' پر سب پروفیسروں کا اتفاق ہوگیا۔

ابوجان نے مجھے کتاب سے محبت کرنا سکھائی۔ تبلیغی نصاب کی کتابیں تو الحمدللہ پڑھتے ہی تھے، پہلی کتاب جو مجھے میٹرک میں باقاعدہ پڑھنے کو دی وہ سید مودودی علیہ الرحمہ کی اسلام کا سیاسی نظام تھی اور حکم تھا کہ اِسے تین دن میں مکمل کر کے ڈسکس کروں۔ پھر اِسی نام کی کتاب مولانا اسحاق صدیقی سندیلویؒ کی دی۔ پھر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی حیٰوۃ المسلمین دی۔ فرماتے تھے کہ تبلیغ کی فضائل کی کتابیں صرف مجمع میں پڑھنے کی نہیں ہیں بلکہ اِنھیں انفرادی مطالعے میں بھی رکھنا چاہیے؛ اِن سے صحابۂ کرامؓ کا سماج اور ثقافت سامنے آتی ہے اور دین کی عملی صورتیں سامنے آتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ مسلمانوں میں دینی ثقافت کے زندہ ہونے کی امید پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے تھے کہ مصنف کا اثر ضرور ہوتا ہے اور تبلیغ کی نصاب کی کتابیں حرکت پیدا کرتی ہیں۔ جو آدمی اِنھیں حرکت سے الگ ہوکر پڑھتا ہے اُسے اِن سے چنداں نفع نہیں ملتا۔

کتاب سے ابوجان کا تعلق ایک طرح سے جمالِ صد رنگ کا آئینہ ہے۔ حضر و سفر میں سونے سے پہلے مطالعہ اُن کی غذا تھی۔ کتابوں کی قیمتی جلدیں بنواتے اور سینت سینت کر رکھتے۔ اُن کی کتابوں کا کاغذ تو اردِ روزگار نے پرانا بھلے کر دیا لیکن اُن کی کتاب کی حالت فتح شدہ قلعے جیسی کبھی نہ ہوتی۔ کتابوں کی میز پر بیٹھنے یا ٹیک لگانے سے منع کرتے۔ لکھے کاغذ کے ٹکڑوں کو زمین سے اٹھا کر اوپر کہیں اُڑا دیتے یا تلف کرتے۔ قلم کو ہمیشہ کان پر رکھتے۔ فرماتے تھے کہ کتاب خرید کر پڑھنی چاہیے، اِس سے نفع زیادہ ہوتا ہے۔ کتاب پڑھنے کے آداب اکثر بتاتے۔ کتابوں کو نشان زد کرنے اور صفحوں کو ''کتے کے کان'' بنانے پر اُنھیں بہت تکلیف ہوتی۔ کتاب پڑھنے کا طریقہ بتایا کہ سرِ ورق سے شروع کرنا چاہیے اور نوٹس لینے چاہییں۔ اُنہی دنوں میں نے ایک رات میں شہاب نامہ ختم کیا اور نوٹس لیے۔ میں کوئی لفظ پوچھتا تو معنٰی بتاتے ہوئے ہمیشہ ڈکشنری کھول لیتے تاکہ مجھے ڈکشنری سے استصواب کی عادت پڑے۔ معنٰی بتانے سے پہلے لفظ کا مصدر نکلواتے اور اِس کے لیے خوب خوب

کھدیڑا کراتے۔ مصدر خود بتانے کی ''سخاوت'' اُنھوں نے بہت کم کی۔ تب کہیں جا کر لفظ کے مطلب کی باری آتی، جو اکثر مصدر کے نکلنے کے ساتھ پہلے ہی سمجھ لگ گیا ہوتا تھا۔ یہ منزل سر ہوجاتی تو لفظ کے مرکبات ومحاورات کی خبر لیتے، اور شیکسپیئر، ٹینی سن اور ملٹن وغیرہ کے استعمالات سناتے جاتے۔ کسی لفظ کی ایسی لگاوٹیں کم ہوتیں تو اُسے لنڈورا (Barren) کہتے۔ وہ بے شمار لفظوں کے ماضی اور مصادر ہی کا نہیں بلکہ پشتوں کا علم رکھتے تھے اور اُن سے کوئی لفظ پوچھ لینے کا مطلب کم سے کم پندرہ بیس منٹ کی علمی سیر ہوتا تھا۔ افسوس کہ میں نے اُن سے اردو کے بہت ہی کم لفظ پوچھے کیونکہ یہ میرا ماحول تھا اور نہ ترجیح۔ مجھے تلفظ (IPA Notation) پڑھنے میں مشکل ہوئی تو چیمبرز ٹوئنٹیتھ سنچری ڈکشنری لے آئے۔ Platts، کنسائز اوکسفرڈ (COD)، غیاث اللغات اور فرہنگِ عمید اکثر استعمال کرتے۔ اردو الفاظ کے معنی Platts کے علاوہ شاید ہی کسی لغت میں دیکھے ہوں۔ دن میں پانچ سات بار ڈکشنریاں دیکھنا اُن کی معمولی بات تھی۔ ڈکشنری سے اُن کی محبت کا عالم یہ تھا کہ میرا رشتہ طے ہونے پر اپنی بہو کے سلام کرائی کے لیے آنے پر اُسے پہلا تحفہ اوکسفرڈ کی ڈکشنری دی۔

☆.....۷.....☆

اب کچھ لازمی بشری عناصر کا ذکر جو میں نے ابوجان کی ذات میں دیکھے۔ پہلی بات یہ کہ اُن کا ذہن ایک آرٹسٹک ذہن تھا اور وہ کبھی کبھی چیزوں کو گلیمرائز کر لیتے تھے۔ اِس لیے بعض اوقات اپنے مطالعے اور اُس کے نتیجے میں بننے والے نظریے کو ایسی جگہ لاگو کرنے کی دلیلیں لاتے جو وہاں کے لیے مناسبِ حال نہ ہوتا تھا۔ آپ اِسے نان پریکٹیکل اپروچ، رجائیت یا سادہ لوحی کہہ سکتے ہیں۔ بعض اوقات کسی ایسے موقع پر شعر کا حوالہ دیتے جہاں لوگ اِس کے لیے تیار نہ ہوتے۔ اُن کے دوستوں کو اکثر گِلہ رہتا کہ وہ مشاعرے میں سنانے کے لیے مناسب کلام انتخاب نہ کرتے تھے؛ مشاعرے کی غزل اور مطالعے کی غزل میں بہت فرق ہوتا ہے (مشاعروں کی پھٹے چُک قسم کی شاعری تو میں نے بھی بہت کی ہے)۔ اِسی طرح بعض اوقات اُن کا مزاج طبیعت پر غالب آجاتا تھا۔

☆.....۸.....☆

ابوجان کی وفات کی خبر سن کر میرے دل پر پہلا خیال یہ گزرا تھا کہ میں اُن کا چہرہ دیکھنے کی نیکی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکا ہوں۔ بس یوں لگتا ہے کہ ایک چھجہ تھا جو سر سے ہٹ گیا ہے اور اب

دھوپ سیدھی مجھ پر پڑتی ہے۔ میں اُن کی زندگی میں آخری بار بہاول پور آیا تو اُنھوں نے ایک ضروری کام کے سلسلے میں تایا جان ساجد اور اورنگ زیب بھائی جان کو بلایا۔ باتوں باتوں میں سب کو گواہ بنا کر میرے بارے میں فرمایا کہ میں صفوان سے راضی ہوں۔ جو قدر کرے گا وہ فیض پائے گا۔ کسی اور بات کے جواب میں فرمایا کہ میری وجہ سے تم (سب گھر والوں) پر مصیبتیں رکی ہوئی ہیں جو میرے بعد ایسے اتریں گی جیسے تسبیح کا دھاگہ ٹوٹنے سے دانے گرتے ہیں۔ قدرِ عافیت کسے داند کہ مصیبتے گرفتار آید۔ (اور میں نے یہ نقد دیکھا: اُن کی وفات پر بہاول پور آتے ہوئے ہماری کوچ کا حادثہ ہوگیا۔ اللہ نے کرم کیا ورنہ بہت بری حالت ہوجاتی۔) اُن کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ ایک بات کے جواب میں فرمایا کہ ''میں دو بار اللہ سے زندگی کی لیز (Lease) مانگ چکا ہوں کہ میرے بچے ابھی چھوٹے ہیں، لیکن اگر اب بلاوا آتا ہے تو میں تیار ہوں۔'' یہ بات شاید لکھنے کی نہ تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا اللہ سے تعلق ایسا تھا کہ وہ یہ کہہ سکتے تھے۔ لاہوتیت کا یہ درجہ بھی اللہ کی عطا ہے، وہ جسے چاہے ارزاں کردے۔ اُس دن اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ موت ایک پل ہے جو دو محبت کرنے والوں کو ملا دیتا ہے۔ میں نے اُنھیں اللہ سے ملاقات کے لیے بالکل تیار پایا۔ اُنھوں نے اپنے کاغذ اور فائلیں وغیرہ بالکل ایسے باندھ کر رکھی تھیں جیسے آج ہی اور ابھی جانا ہے۔ اُنھوں نے وفات سے ڈیڑھ دو گھنٹے قبل قرآنِ پاک اور تفسیر بیان القرآن ختم کی تھی۔

ابوجان ۱۲/مئی ۱۹۳۹ء کو دوراہا منڈی ریاست پٹیالہ میں پیدا ہوئے۔ والدین کی پانچویں اولاد تھے۔ نجیب الطرفین راجپوت تھے۔ والد چوہان اور والدہ کی گوت سروئے تھی۔ تایا جان ساجد کی بیان کردہ خاندانی روایت کے مطابق بمبو خاں اِس سورج بنسی راجپوت خاندان کے پہلے مبارک نہاد آدمی تھے جنھوں نے سید احمد شہیدؒ کے خلاف لڑتے ہوئے قید ہوکر چند دن میں اسلام قبول کیا اور بقیہ زندگی جماعتِ مجاہدین کے دوشا دوش دادِ شجاعت دینے کے بعد بالاکوٹ کے آخری معرکے میں جان جاں آفریں کے سپرد کی۔ ابوجان نے زندگی کا غالب حصہ بہاول پور میں گزارا اور ۷/ دسمبر ۲۰۰۰ء کو نمازِ تراویح کے لیے نکلتے وقت حرکتِ قلب بند ہونے سے وفات پائی۔ اللہ نے اُنھیں جان کندنی کی تکلیف سے بچایا۔ نمازِ جنازہ تبلیغی جماعت بہاول پور کے امیر مولانا محمد اشرف صاحب نے پڑھائی جس میں ہر مکتبِ فکر کے لوگ شامل تھے۔ تبلیغی مرکز میں بھی اُن کی وفات کا اعلان ہوا اور اللہ کے راستے

میں نکلی ہوئی جماعتوں کو نمازِ جنازہ میں شریک ہونے کو عرض کیا گیا۔ اُن کا جنازہ بہاول پور کے چند بڑے جنازوں میں سے ایک تھا جس کی لوگ اب تک مثال دیتے ہیں۔ قبر کے تعویذ پر اُن کا یہ شعر بھی کندہ ہے: ؎

رکیں گے تجھ سے ملنے تک یہیں ہم
سمجھتے ہیں کہ دنیا ہے سرائے

اُن کی تاریخِ وفات معتدبہ وقت صرف کرکے میں نے یہ نکالی ہے:

آہ ابو جی عابد اِنّی مُتَوَفّیکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُکَ (۱۴۲۱ھ) اور

کورچ عابد: اِنّی مُتَوَفّیکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُکَ (۱۴۲۱ھ)

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۵۶ کے اِسی ٹکڑے سے علامہ اقبال نے سرسید احمد خاں کی تاریخِ وفات نکالی تھی۔[۳]

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى. اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن.

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ حافظ صفوان محمد چوہان، The Passing of the Old Guard، مشمولہ سہ ماہی الزبیر، شمارہ۔۱، ۲۰۰۵ء۔ص ص ۴۷-۴۸

۲۔ شان الحق حقی، MSN پر حافظ صفوان محمد سے چیٹنگ (انگریزی سے ترجمہ ونقلِ حرفی)، مورخہ ۱۷/ستمبر ۲۰۰۵ء۔

۳۔ کلوروی، ڈاکٹر صابر: کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال (متروک اردو کلام)، طبع اوّل، اقبال اکادمی، لاہور (۲۰۰۴ء)۔ص-۵۰۶